رشکِ سخنم چیست نہ شہد ہوس است ایں
تلخابۂ سرجوش گدازِ نفس است ایں — غالب

حسنِ تخیل

یعنی

منشی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی

وکیل و پیروکار پولیس ریاست بھوپال

کی

اُن دلگداز اور پُر درد نظموں کا مجموعہ

جو

ادب اُردو کے بہترین رسائل ادیب، الناظر، زمانہ، پنجاب ریویو، اصلاحِ سخن، تنویر المشرق، خلاصہ، لسان العصر، زبان، مشورہ، صلائے عام، صبح بہار، کمال وغیرہ میں شائع ہو کر قبولیتِ عام کا فخر حاصل کر چکی ہیں۔

باہتمام پنچکوڑی متر پرنٹر و پبلشر
انڈین پریس الہ آباد میں چھپکر شائع ہوا

۱۹۱۲ء
قیمت فی جلد ۸ر

فہرست مضامین

خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب
مشیر مال ریاست بہاولپور

The Indian Press, Allahabad.

تہدیہ

بزرگِ قوم عالیجناب خان بہادر میرزا سلطان احمدؒ
صاحب قبلہ وزیر مال ریاست بہاولپور جنکی فلسفیانہ
تصنیفات کی بلند پائگی ادب اُردو کے لئے مایۂ
نازش ہے اور جنکے بہترین رسائل میں شائع ہونیوالے
پاکیزہ مضامین انشاپردازی کا اعلیٰ نمونہ ہونے کی
وجہ سے لٹریچر کی جان کہے جانیکے سچّے مستحق ہیں
باوجود فرائض منصبی کی اُن اہم ذمہ دارانہ مصروفیتوں
کے جنکے صلے میں گورنمنٹ ہند نے سنہ ۱۹۱۰ء میں

تمغۂ قیصرِ ہند اور سنہ ۱۹۱۰ء میں خان بہادری کا معزز خطاب دیکر جناب ممدوح کی مدبّرانہ قابلیت اور حُسنِ خدمات کی قدر دانی کا ثبوت دیا ہے۔ ایک عرصۂ دراز سے نہایت وسیع پیمانے پر مُلک کی علمی خدمت فرما رہے ہیں منجملہ دیگر تصنیفات کے صاحبِ موصوف کا ایک ضخیم رسالہ "فنِ شاعری" کے نام سے شائع ہوا ہے جو اُردو میں اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے۔

نہ صرف بلحاظ اِن عمدہ مناسبتوں کے بلکہ عقیدت کیش مصنف اپنے دلی جوشِ نیازمندی سے باجازت خاص اس مختصر شیرازۂ کلام کو جناب ممدوح کے اسم گرامی پر بمصداق ذیل معنون کرنے کا فخر حاصل کرتا ہے ؎

زقدر و شوکتِ سلطاں نگشت چیزے کم
کلاہ گوشۂ ارشد بآفتاب رسید

احقر
ارشد تھانوی

ریاست بھوپال
یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۱ء
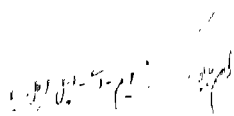
ارشد تھانوی

میرا عنوان ہے عجب شان سے زیب ہستی * محو نظارۂ تصویر فریب ہستی

The Indian Press, Allahabad.

زبان عرب کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے، کہ شعراء خدا کے شاگرد ہیں، یعنی بیواسطہ اُن کو مبدء فیاض سے فیض پہنچتا ہے۔ غور کیجئے کہ جب کوئی شاعر یا انشا پرداز نظم یا نثر لکھنے بیٹھتا ہے، تو اُس کے ہاتھ میں صرف قلم اور سفید کاغذ ہوتا ہے۔ وہ یہ تو ضرور سوچ لیتا ہے، کہ مجھے فلاں عنوان پر لکھنا ہے، لیکن اُس کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ میں کیا لکھوں گا، اور عنوان (دعویٰ) پر کیا کیا دلائل لاؤں گا، کس کس پہلو سے بحث کروں گا؛ مگر تھوڑی سی دیر میں، جب طبیعت متوجہ ہوتی ہے، اور قلم جولانیاں دکھاتا ہے، تو وہی سادہ کاغذ سیاہ ہو جاتا ہے۔ آخر یہ کہاں سے آیا؟ اُسی مبدء فیاض کی طرف سے، جسے الہام کہنا بجا ہے۔

خیالات در آئی میں طبیعت کا عجیب رنگ ہوتا ہے۔ جس طرح مکڑی اپنے ہی لعاب دہن سے جالا پورتی چلی جاتی ہے، اور اپنا خیمہ تننے میں اُس کو

کسی کی مدد کی حاجت نہیں ہوتی، یہی کیفیت شاعر اور انشا پرداز کی ہوتی ہے یہ قدرت کی طلسم کاری، بلکہ اعجاز ہے، کہ تہیدست شاعر صفحۂ قرطاس پر جواہر بے بہا بکھیرتا چلا جاتا ہے، جو اس کے خزانۂ دل یا کانشنس کی کان میں پہلے سے موجود اور مخزون نہیں ہوتے، بلکہ جس قدر درکار ہوتے ہیں مبدء فیاض اُسیقدر بتدریج آناً فاناً عطا کرتا رہتا ہے۔ پھر یہ اُن کو اپنے لئے کام میں نہیں لاتا، بلکہ دنیا کو اُن سے ہمیشہ کے لئے مالا مال کرتا ہے، اور انسانوں کے سینے ان جواہرات کے گنجینے ہو جاتے ہیں۔ اگر شاعروں، اور انشا پردازوں، اور مصنفوں کا وجود نہ ہوتا، تو دُنیا جہل کے گھُپ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتی، اور آنکھیں، مانگتی پھرتی۔ موجودہ زمانے کا سائنس اور فلسفہ اور لٹریچر میرے دعوے پر خوب روشنی ڈالتا ہے۔ علم و عقل کی جو کچھ جگمگاہٹ نظر آرہی ہے، سب انشا پردازوں اور مصنفوں کی بدولت ہے۔ مؤرخوں نے اپنی دماغ سوزیوں سے عبرت کے کیا کیا سبق آنے والی نسلوں کو نہیں پڑھائے، اُن کے دلوں میں کیا کیا حوصلے اور اُمنگیں اور ولولے پیدا نہیں کئے، کیسے کیسے مُلک فتح نہیں کرائے جنگوں کے جگر فرسا معرکوں میں رجز خوانوں نے طبقے اُلٹ دئے ہیں، مردہ دلوں کو زندہ کر دیا ہے، شکست کو فتح بنا دیا ہے۔ کوئی قوم ایسی نہیں، جو جنگوں میں رجز کے اشعار نہ پڑھتی ہو اور مردانِ نبرد آزما کے حوصلے نہ بڑھاتی ہو۔ جنگی باجے اور سرود سب اشعار ہی ہیں۔

میں نہیں کہتا کہ تمام شعرا حکیم و فلسفی ہیں، اور سب کا کلام یکساں پُراثر اور طبائع میں انقلاب پیدا کرنے والا ہے، خصوصاً اُردو شعرا کا کلام، بلکہ مقصد یہ ہے، کہ جس قسم کا کلام کسی کی طبیعت سے سرزد ہوتا ہے، وہ ایک الہام ہوتا ہے، اور الہام کے لئے یہ ضرور نہیں کہ وہ اچھے ہی خیالات لیکر وارد ہوتا ہو۔ بلکہ اس کا حصر کانشنس پر ہے۔ جیسا کانشنس ہوگا۔ اُس پر ویسا ہی الہام ہوگا۔ شعر گوئی کے لئے اولاً موزونیِ طبع درکار ہے، پھر مشق۔ چند روز میں خامی پختگی سے بدل جاتی ہے پیش پا اُفتادہ پست خیالات بلند ہو جاتے ہیں خود بخود طبیعت سے نیچرل اور سوشیل مضامین نکلنے لگتے ہیں: بشرطیکہ اُن کا ارادہ کیا جائے۔ اور طبیعت کو اگر شاعری کی اصلی حقیقت کے ادراک پر مائل کیا جائے، تو یہی تغزل اور ریختہ، جس کو اُردو شعرا شاعری کی جان سمجھتے ہیں، کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔

ناظم شروانی خاقانی لکھتا ہے ؎

دلم قصرے مشبک داشت ہمچوں خانِ زنبوراں — بروں سادہ در و بام و دروں نعمت فراوانش

نہ خانِ عنکبوت آسا سراپردہ زدہ بیروں — دروں ویرانہ و بر خوان مگس ہنبد بریانش

یعنی میرا دل اس سے پہلے ایک سوراخ دار محل رکھتا تھا، جیسا شہد کی مکھیوں کا چھتا، کہ باہر سے تو دروازہ اور بام بالکل سادہ مگر اندر بہت سی نعمت (شہد) سے معمور، یہ نہیں کہ مکڑی کے جالے کی طرح کہ باہر تو سراپردہ تنا ہوا اور اندر ویرانہ، اور خوان پر چند بھنی ہوئی مکھیاں رکھی ہیں، جنکے کھانے سے قے ہو جائے۔ شعر میں

بلاغت یہ ہے کہ شہد بڑی نعمت ہے؛ اگر کوئی شخص قے کے مرض میں مبتلا ہو، تو شہد کے استعمال سے شفا ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شاعری ایک نعمت ہے، بشرطیکہ اخلاقی اور فطری ہو۔ عشقیہ (فسقیہ) مضامین کانشنس کو تباہ و برباد کرنے والے ہیں، اور ایسے ہیں، جیسی شہد کے مقابلے میں قے اور مکھی۔ شعر وہی ہے، جس سے انسانی اخلاق درست ہوں، الٰہیات کی چاشنی بھری ہو، فطرت و معرفت کے خمیر میں گوندھا گیا ہو۔ الہام جس طرح نثر میں ہوتا ہے، اسی طرح نظم میں ہوتا ہے۔ بُرے خیالات بھی الہام ہی ہیں۔ مولانا عبدالقادر بیدل مرحوم اپنے نکات میں فرماتے ہیں:-

اگر منکرِ نبوت نۂ با وسوسات ہم جز بتعظیم پیش میا، واگر بر تجلّی ایمان داری، بہیچ جانب چشم بے ادب مکشا۔

یعنی اگر تو نبوت کا منکر نہیں تو وسوسات کی بھی تعظیم کر، کیونکہ وسوسات ہی بالآخر سچّے الہامات ہو جاتے ہیں، اور اگر تو تجلّی پر ایمان رکھتا ہے، تو ہر شئے کو ادب سے دیکھ۔ کفر بھی جلوۂ الٰہی کا منظر و مظہر ہے۔ اسی بنا پر مولوی جامی فرماتے ہیں ؎

شاعری جزوے ست از پیغمبری   جاہلانش کفر خوانند از خری

انسانی طبیعت کو کلامِ موزوں، اور مقفّیٰ و مسجّع زیادہ مرغوب ہے، لہٰذا حکما اور فلاسفہ نے زیادہ دلکش بنانے اور طبائع میں اسرارِ قدرت کی چاشنی رچانے کو نظم سے کام لیا ہے، تاکہ نفوس جلد قبول کر لیں، جیسے شربت، برف اور کیوڑا

اور گلاب ملانے سے زیادہ لذیذ اور دلچسپ ہو جاتا ہے، اور طبیعت کو اُسکے پینے سے سکون اور سیرابی حاصل ہوتی ہے۔ پھر اشعار جلد یاد ہو جاتے ہیں، نثر یاد نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف بڑے بڑے شعراء اور حکماء کو بلکہ تھوڑے لکھے پڑھے آدمیوں کو بھی، اُن کے مذاق کے موافق بیسیوں اشعار یاد ہوتے ہیں، اور اکثر اوقات بڑے مزے سے پڑھتے اور گنگناتے اور وجد میں آتے ہیں۔ جب مقرر یا واعظ تقریر کرتا ہے، تو حسبِ موقع اشعار پڑھنے سے سامعین کو گرماتا اور اپنی تقریر کو دلچسپ بناتا ہے۔

موزوں اور مقفّیٰ کلام سے انسان کو بالطبع انس ہے، اور اسکی وجہ یہ ہے کہ حرکاتِ نبضیہ، دورانِ خون کے ساتھ، ہر وقت تڑاق پڑاق چلتی رہتی ہیں۔ جن میں موزونیت ہی نہیں، بلکہ لے اور سُر حسبِ قواعدِ موسیقی موجود ہیں، کیونکہ راگ جس سے عبارت ہے، وہ اصوات کا تکرر ہے یعنی تال اور سُر کا بار بار لوٹ لوٹ کر آنا، اس طرح کہ ساتھ ہی خلوِ زماں بھی ہو، یعنی کچھ وقفے کے بعد ایک ہی آواز کا توارُد ہوتا رہے، جیسی ٹھیکے کی گت۔ اگرچہ پٹیں بڑھا کر دوسری آوازیں بھی نکلتی ہوں، مگر اُس ٹھیکے سے باہر نہ ہوں۔ مثلاً پکھاوج وغیرہ پر جب دھرپت گائی جاتی ہے، تو ساتھ ہی پرَن کا سلسلہ ہوتا ہے، مگر اصل ٹھیکے اور گت سے باہر نہیں ہوتا، بلکہ حسنِ صوت اور موسیقی کا رنگ جمانے اور راگ کا کمال دکھانے کے لئے ہوتا ہے۔ شعر کے موزوں اور دلکش بنانے میں بھی دخل

صنائع و بدائع اور محسنات بیان و معانی کو ہے۔

تمام اقوام کو موسیقی کی جانب فطرۃً میلان ہے، جس کے لئے شعر کا ہونا ضروری ہے۔ اگر شعر نہ ہوتا تو موسیقی ایک جسم بیجان ہوتا۔ جو شخص کچھ گاتا یا گنگناتا ہے، اور جو لوگ آلات موسیقی کا شغل رکھتے ہیں، غیر ممکن ہے کہ وہ شعر سے خالی ہوں۔ جنگی باجے میدانِ ہیجا میں سپاہ کے اندر غلیان اور ہیجان پیدا کر دیتے ہیں۔ مولینا نظامی جنگ روس و سکندر میں فرماتے ہیں ؎

ز آواز خر مہرۂ گاؤ دُم　　علی اللہ بر آمد ز رو ئینہ خُم

ایک ہندی دوہا ہے ؎

سورا رن میں جائے کر، کا ہڑ ڈھونڈہت ساتھ

ساتھی تیرے تین ہیں: ہیا کٹار اور ہاتھ

یعنی "اے بہادر! تو جنگ میں کس کا ساتھ ڈھونڈھتا ہے؟ تیرے ساتھی صرف تین ہیں، دل اور تلوار اور ہاتھ" ایسے ہی جرارت دلانے والے رجز و تک فوج جان دیدیتی ہے۔ (عربی میں اشعار جنگ کو رجز کہتے ہیں، اور ہندی میں کڑکا)

عرصہ ہوا، میرے وطن (شہر میرٹھ) میں ایک تیرتھ کے لئے جاتری نکلے۔ میں بزاز میں کپڑا خرید رہا تھا۔ تیرتھ کے سنگیت ایک وجد و رقص کی حالت میں ننگے سر، ننگے پاؤں ستار اور طنبورا وغیرہ پر یہ ترانہ بیخودی کے عالم میں تیرتھ کے آگے آگے

گاتے جاتے تھے ؎

آوے درد میں، آوے درد میں　　بپتا میں آوے، راما آوے درد میں

سکھ سمپت میں آوے ناہیں　　وا مہا بید تو دھاوے درد میں

یعنی پرمیشور جب آتا ہے تکلیف اور مصیبت کے وقت آتا ہے۔ وہ سکھ اور چین کے سمے میں نہیں آتا۔ مہا بید (بڑے طبیب) کا تو یہی فرض ہے، کہ بیماری کے وقت دکھ سے موکش (نجات) دینے کو آئے۔

یہ ترانہ سن کر مجھ پر وہ عالم طاری ہوا جسکا مزہ ابتک لے رہا ہوں۔ یہ سیدھے سادے نیچرل انترے ہیں۔ نہ ان میں رنگ آمیزی ہے، نہ مبالغہ ہے، نہ صنائع بدائع ہیں، مگر کتنے پیارے اور دلکش ہیں۔ ہمارے سیکڑوں شعرا جن کا مذاق جن اور پری از عیب بری اور حور دور از قصور از دنیا الغفور سے آگے نہیں بڑھتا ایسے انتروں کو واہیات و خرافات اور رندان تو جملہ درد ہا نند بتائیں گے اِس مضمون سے ملتا جلتا ہے ایک دوہا کسی ہندی کویشر نے اور بھی کہا ہے ؎

دکھ میں سب ہر کو بھجیں، اور سکھ میں بھجے نہ کوے

جو سکھ میں ہر کو بھجے، تو دکھ کاہے کو ہوے

سبحان اللہ۔ یہ سحر حلال ہے، سہل ممتنع ہے، یعنی خدا کو سب دکھ میں یاد کرتے ہیں، اگر سکھ میں یاد کریں، تو دکھ ہی کیوں ہو!! دیکھئے، یہ دوہا غافل انسانوں کی حالت کا آئینہ ہے۔ اِس کے جتنے معنی چاہو پھیلاتے چلے جاؤ۔ اِس کے مطابق

ایک اور مشرقی حکیم کہتا ہے، کہ جو فاتح سپہ سالار اپنی شکست کو فتح کے وقت نہ بھولے گا، وہ کبھی شکست نہ کھائیگا۔ یعنی فتح کے وقت شکست کو نہ بھولنا چاہئے

بھاشا کے کوِیشر عاشقانہ مضامین بھی غضب کے لکھتے ہیں، انہیں بھی نیچرل چھینٹا ہوتا ہے ؎

باہنہ چھڑا اسے جات ہو نبل جان کے موے
ہردے میں سے جاؤگے، تو مردیدؤں گی تمے

یعنی مجھے کمزور جان کر باہنہ چھڑا کر جاتے ہو، میں تو تمہیں مرد جب سمجھوں گی کہ دل میں سے بھی چلے جاؤ۔" شوق اور بروگ بھر اکتنا پیارا دوہا ہے۔

شاعری تمام علوم و فنون اور معلومات کا منتہا ہے۔ یعنی شاعر جن امور کا مشاہدہ کرتا ہے، اور اُن سے تجربہ اُٹھاتا ہے، نظم و نثر یا مختلف اشعار میں اُنکا اظہار کرتا اور دنیا کو معلومات میں آپ جیسا بناتا ہے۔ وہ جو کچھ لکھتا ہے، تحقیق و انکشاف کے بعد لکھتا ہے، پس شاعر کے لئے لٹریچر اور محاورات ہی سے واقف ہونا کافی نہیں، بلکہ تمام ضروری علوم و فنون کے اکتساب کی بھی ضرورت ہے! کیونکہ جس قدر معلومات وسیع ہونگی، اسی قدر طبیعت میں مضامین کا تراکم ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مشہور ایشیائی شعرا حکیم اور فلسفی اور متکلم گزرے ہیں۔ ان کا کلام دیکھا جاتا ہے تو وسعتِ معلومات پر بے تحاشا تحسین و آفریں زبان سے نکلتی ہے۔

خاقانی اپنے حاسدوں اور اپنے کلام کے سارقوں کی مذمت میں لکھتا ہے ؎

من میوہ دار حکمتم از نفسِ ناطقہ
ویشاں زروئے نامیہ جز ناروَن نیند

ناروَن انار کی چھوٹی کلی کو کہتے ہیں، جو نہ بڑھتی ہے، نہ اُس کا انار بنتا ہے، کھل کر مرجھا جاتی ہے۔ اور جھوٹے پھول بعض ترکاریوں، کدو وغیرہ کو بھی لگتے ہیں، اور جلد مُرجھا کر معدوم ہو جاتے ہیں، اور بعد میں سچے پھول لگتے ہیں، اور انہیں کے کدو بنتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں تو اپنے نفس ناطقہ کے فیض سے حکمت کا میوہ دار درخت ہوں، پھولتا پھلتا ہوں، اور یہ (میرے حاسد اور سارقین) قوت نامیہ کی رُو سے انار کی کچّی کلی ہیں، یعنی قوتِ نامیہ کا اُن پر اُتنا ہی اثر ہوتا ہے کہ کلی بن کر کھلے اور برباد ہو گئے۔ ایک اور قصیدے میں اپنے سارقانِ سخن کی مذمت کرتے ہوئے لکھتا ہے ؎

دلِ شاں زمیوہ دارِ حدیثم خورد غذا
انجیر خور عجیب نباشد غرابِ شاں

یعنی ان کا دل میرے میوہ دار کلام سے غذا کھاتا ہے۔ اگر اُن کا کوّا انجیر کھانیوالا ہے تو یہ تعجب کی بات نہیں۔ بات یہ ہے کہ کوئی جانور کچّا انجیر نہیں کھا سکتا، کیونکہ اُس میں لس ہوتا ہے، چونچ چپک جاتی ہے؛ مگر کوّا چونکہ سیانا جانور ہے، لہذا کھاتا جاتا ہے اور چونچ صاف کرتا جاتا ہے۔ پس شکم سیر ہو کر انجیر چٹ کر جاتا ہے۔ مقصود شعرا کی تحقیقات و معلومات کا اظہار ہے، کہ ان کی نظر کتنی وسیع تھی۔

میں بیحد خوش ہوتا ہوں، جب دیکھتا ہوں کہ ہندوستان بھی مہذب اور شائستہ لٹریچر میں ترقی کر رہا ہے، اور نیچرل اور سوشیل انشاپرداز اور شعرا پیدا ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کے باشندے فطری ذہانت و فطانت میں مشہور ہیں۔ گزشتہ شعرا اور کویشر کیا کچھ نہیں کر گئے۔ اُن کے کارنامے موجود ہیں، جنکے ترجمے مغربی ممالک کے باشندوں نے بڑے فخر سے اپنے لٹریچر میں کئے ہیں، اور اُن کو ورسوں اور کورسوں میں داخل کر لیا ہے۔ اِنکے کمالات، علوم و فنون پر ہندوستان جسقدر فخر کرے بجا ہے۔ اُن کے جواہرات ویرانوں کے گوشوں میں دبے ہوئے تھے، مغربی جوہریوں نے اِن کو نکالا اور تاج حکومت میں جڑا۔ اب تاج کی طرف سے کوشش ہو رہی ہے کہ اہلِ ہند فکر کی کاوش سے ویسے ہی جواہرات اپنی کانِ طبیعت سے نکالیں، اور وہ بھی تاج میں جگہہ پائیں۔ کان کن پیدا ہو رہے ہیں، مگر اِن کی طبیعت کے تیشہ میں ابھی تک تیزی نہیں آئی۔ تاہم "دیر آید درست آید"، پر نظر کر کے مایوسی کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

اولوالعزمی اور ہمّت مردانہ بڑی نعمت ہے۔ قدرت بخیل نہیں۔ جو کام ایک انسان کر سکتا ہے، کیا وجہ ہے کہ دوسرا نہ کر سکے۔ تلسی داس، کلیشو داس، کالی داس، کی نظیریں کیوں پیدا نہ ہوں، خاقانی، انوری، فردوسی، نظامی وغیرہ جیسے باکمال لوگ دنیا میں کیوں نہ آئیں۔ فیض کا دروازہ بند نہیں ہوا، زمانہ عقیم نہیں ہو گیا۔ انسان کے ہاتھ میں قدرت نے طرح طرح کی طاقتوں کی کنجیاں

دیدی ہیں ؎

درِ فیض است مشتاقِ کشایش ناامید اینجا
بہ رنگِ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا

گزشتہ اہل کمال نے کیسی کیسی محنتوں اور جانکاہیوں سے علوم و فنون حاصل کیئے۔ کربتِ غربت اختیار کی۔ راحت و آرام کو تکالیف پر قربان کیا۔ فقر میں زندگی بسر کی۔ ہر وقت کتاب سے کام رکھا۔ نہ اچھا کھانا، نہ اچھا پہننا، بلکہ فاقے بھوگے۔ مل گئی تو کھالی، ورنہ ودّیا کا بھوگ ہے اور وہ ہیں۔ اسی میں مگن، اور اسی میں خورسند ہیں۔ پاٹ شالاؤں اور مدارس میں اینٹوں اور پتھروں کا فرش، اُن کے لئے کمخواب اور سمور و سنجاب کا گہوارہ ہے۔ مٹی کا چیکٹ لگا دیا ہے جس میں سرسوں کا تیل پڑا ہے۔ کتاب سامنے رکھی ہے، چراغ کا دھواں دماغ میں جارہا ہے، کیسا لمپ اور کیسا گلوب۔ پھر ایسی جانکاہیوں اور دماغ سوزیوں کا اِن کو کیسا پھل ملتا تھا۔ کیسے کیسے باکمال وِدوان فارغ التحصیل ہو کر نکلتے تھے، جنکا جواب موجودہ زمانے میں، جسے اپنی شائستگی اور تعلیم و تربیت پر گھمنڈ ہے، پیدا ہونا محال ہو رہا ہے، اور جنکی تصانیف آج کے روز کالجوں اور یونیورسٹیوں کی جان ہیں۔

موجودہ زمانہ تو طلبا کے لئے بہشت ہے۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا لوازم تعلیم سے ہے۔ حفظِ صحت کا ہر دم لحاظ ہے۔ آئے دن تعطیلوں کی بھرمار، گویا سال بھر میں چھ ماہ تعلیم پائیں، اور چھ ماہ ڈنڈے بجائیں۔ پاس ہو جانا بھی قسمت سے ہے،

ترک تکمیل علوم سے یہی وجہ ہے کہ ویسے علما اور فضلاء اور پنڈت پیدا نہیں ہوتے۔ کیا زبانِ سنسکرت میں کوئی فصیح اور بلیغ نظم لکھ سکتا ہے؟ ہمارے خیال میں تو کوئی صحیح نہیں لکھ سکتا۔ سنسکرت تو بہت دور ہے، بھاشا کا بھی کوئی شاعر کامل نہیں۔ یہی حال زبان عرب کا ہے۔ کیا کوئی شخص بے تکلف ہندوستان میں زبان عرب بول سکتا ہے، یا عربی میں فصیح و بلیغ بلکہ صحیح نظم و نثر لکھ سکتا ہے، ہرگز نہیں۔ اُردو شاعری ویسی ہی ہے، جیسی طرہ اور کلغی والوں کی خیال بازی، جو دف پر گائی بجائی جاتی ہے۔ پس وہ شعراء اُردو متقنمات سے ہیں، جو موجودہ زمانے میں اُردو زبان کو شایستہ بنا رہے ہیں، اور اس میں سوشیل اور نیچرل رنگ پیدا کر رہے ہیں۔

کتاب حُسنِ تخیّل جو جناب منشی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی کی جدت پسند طبیعت کا کارنامہ اور مختلف اقسام نظم کا مجموعہ ہے، میرے سامنے ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ زیادہ تر موجودہ زمانے کے نیچرل اور سوشیل رنگ میں رنگا ہوا اور شعرائے اُردو کے ممتاز کلام میں سے ہے۔ مصنف نے پاکیزہ طبیعت پائی ہے۔ کلام مربوط و منضبط ہے۔ حشو کم ہے۔ نزاکت و ندرت بھی پہلو بہ پہلو ہے۔ مغربی و مشرقی دونوں رنگ ہیں۔ جیسے کسی صنم کی چمکتی ہوئی پیشانی پر مختلف رنگوں کا قشقہ، جو از حد دلاویز اور دلکش ہو۔ یہ دورنگی اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی، جب تک کوئی مصنف مشرقی اور مغربی دونوں قسم کا تعلیم یافتہ اور دونوں کے جذبات و خیالات سے

ماہر نہ ہو۔ اور چونکہ اُردو زبان روز بروز صاف و شفاف و مجلّیٰ ہو کر اپنے نکھار کی
بہار دکھا رہی ہے، اُس میں بالطبع یہ خاصہ ہے کہ ہر زبان کے خیالات کو جذب
کر لیتی ہے، اور اپنے لٹریچر کے قالب میں ڈھال کر کچھ اور ہی رنگ روپ پیدا کر دیتی
ہے۔ لہذا یہ مجموعۂ نظم اُردو زبان کی صنعت کاری سے عجیب آن بان دکھا رہا ہے
اجنبی زبان کے خیالات کا اپنی زبان میں لانا، اور نظم کے دلکش اسلوب میں ترتیب
دینا آسان کام نہیں، خصوصاً جبکہ ترجمہ کیا جائے۔ کیونکہ مغربی زبانیں سب مکمل ہیں اور
اُردو زبان نے ابھی تکمیل کے پہلے زینے پر قدم رکھا ہے، اور ترجمے کے لئے الفاظ
کا ملنا اُردو جیسی غیر مکمل زبان میں جیسا کچھ مشکل ہے، اُسے مترجم ہی خوب جانتے ہیں
اور پھر اُن کو نظم کی لڑی میں پرو کر پبلک کے گلے کا موزوں و مرغوب ہار بنانا تا شکال
پر اور بھی طرّہ ہے۔ آپ جانئے ایک تو کریلا پھر نیم چڑھا۔ اس لئے جناب ارشد حیقدر
داد اور صلہ کے مستحق سمجھے جائیں، بجا ہے۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ آپ نے خُداداد
طبیعت پائی ہے، کسی سے تلمّذ نہیں۔ اور ایسے افراد بہت سے ہیں، جن کو تلمّذ
براہ راست مبدءِ فیاض سے ہے۔ طبیعت کا موزوں ہونا اکتساب پر موقوف
نہیں۔ مولوی روم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

من نہ خواندم فاعلاتن فاعلات — شعر میگویم چوں آبِ حیات

اب رہی مضامین کی پستی و بلندی یا تسامح اور صنعتِ تالیف، یا کوئی فروگزاشت۔
اس سے کسی انسانی کلام کا خالی ہونا شاذ و نادر ہے۔ بڑی بات یہ دیکھنا ہے کہ

شاعر نے کیسا خونِ جگر کھایا ہے، اور نظم میں اُسکو کیا کیا دشواریاں لاحق ہوئی ہیں۔ اور جس شعر میں کوئی سقم رہ گیا ہے اُسکی کیا وجہ ہے۔ اعتراض کر دینا آسان ہے، مگر ویسا نمونہ دکھانا مشکل ہے۔ بعض اعتراضات قصورِ سخن فہمی اور فتورِ سوءِ ذہن کا بھی نتیجہ ہوتے ہیں۔ مولینا نظامی گنجوی رہ نے بادشاہ کی تعریف میں شعر ذیل لکھا تھا

چو بر دریا زنی موجِ پلالک بماہی گاؤ گوید کیف حالک

ایک طالب علم نے کہا " مصرعۂ ثانیہ غلط است چہ حالک بایستے نکہ منصوب۔ زیرکہ حالک مبتدا ء موخر واقع شدہ است " مولینا نظامی نے ہنسکر فرمایا " شعرِ مرا بمدرسہ کہ بُرد۔ گاؤ نحو نداند " یعنی میرا شعر مدرسہ میں کون لے گیا " مولینا کا یہ فرمانا بطورِ مذاق تھا۔ یعنی شعر کے مصرعہ دوم میں کیف حالک گائے کا مقولہ ہے اور گائے نحو نہیں جانتی کہ صحیح اعراب پڑھ سکے۔ مگر در حقیقت بیوقوف معترض پر تنبیہ تھی کہ تجھے یہ معلوم نہیں کہ پلالک بفتح و ضم دونو طرح مستعمل ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے ممدوح اگر تو دریا پر تیروں کی موج مارے، یعنی تیر برسائے، تو گاؤ زمین حوت سے کہے کہ تیروں نے تیرا کیا حال کر دیا۔ پُرانے خیالات کے موافق کرۂ ارض گائے کے سینگوں پر ٹھہرا ہوا ہے اور گائے مچھلی پر، اور جب زلزلہ آتا ہے تو اسکی یہ وجہ ہوتی ہے کہ گائے اپنا سینگ بدلتی ہے یعنی ایک سینگ تھک جاتا ہے، تو کرۂ ارض کو دوسرے سینگ پر اُٹھاتی ہے۔

اب ہم حضرت ارشد کے چند اشعار مع تنقید ذیل میں درج کرتے ہیں، اور

اسی پر اس مختصر دیباچہ کا خاتمہ ہے۔ مناجات میں لکھتے ہیں ؎

آتا نظر نہیں ہے، گو آستان تیرا لیکن بنا ہے سب کے دل میں مکان تیرا

مصرعۂ اولیٰ کی بندش میں اُلجھن اور تقدیم و تاخیر ہے اور دوسرے مصرعے میں خود دل کو مکان بنانا چاہئے، نہ کہ مکان کے اندر مکان۔ مثلاً

دیکھا نہیں کسی نے گو آستان تیرا لیکن ہر اک بشر کا دل ہے مکان تیرا

ہر ایک کو عطا کی اک شانِ خاص تو نے رکھا ہر اک طبیعت میں اختصاص تو نے

خاص اور اختصاص میں ایطاء ہے، کیونکہ مادّہ دونوں کا ایک ہے۔ لہذا پورا مصرعہ تغیر طلب ہے ع

قدرت پر اپنی رکھّی بُرہانِ خاص تو نے

بلبل کو گلستاں میں آہ و فغاں ملی ہے پاکر ہنسی، چمن کی ہر اک کلی کھلی ہے

مصرعۂ اولیٰ میں گلستاں کے ہوتے دوسرے مصرعے میں چمن حشو ہے، اور ہنسی پانا محاورہ نہیں ہے ع

کرنے کو خندہ اُس پر اک اک کلی کھلی ہے

دی سرو کو بلندی، نرگس کو چشمِ حیراں لالہ نے داغ پایا، سنبل نے زلفِ پیچاں

دونوں مصرعے باہم مربوط نہیں۔ مصرعۂ اول میں تقدیہ، دوسرے میں لزوم ع

لالہ کو داغِ حسرت، سنبل کو زلفِ پیچاں

سوزِ نہاں کے عنواں سے تحریر فرماتے ہیں ؎

تپشِ دل نے عجب شان بنا رکھی ہے   شررِ عشق نے اک آگ لگا رکھی ہے

تپشِ دل اور شررِ عشق میں کچھ فرق نہیں ع

جگر و سینہ میں اک آگ لگا رکھی ہے

فرطِ سوزش سے ہوئے آبلے پیدا لیکن   شمع کی طرح گدازی ہے مجھے محفل میں

مطلق گدازی محاورہ نہیں۔ البتہ دلگدازی جگرگدازی محاورہ ہے، یا صرف گداز ع

شمع ساں سینہ گدازی ہے مجھے محفل میں

ہمہ تن داغ ہوں، داغوں سے نمایاں ہوں میں   چشمِ ناظر کے لئے سرو چراغاں ہوں میں

چشمِ ناظر محاورہ نہیں ع چشمِ بینا کے لئے سرو چراغاں ہوں میں۔ اور حشو کا

خیال ہو تو یوں بہتر ہے ع

چشمِ عبرت کے لئے سرو چراغاں ہوں میں

اشعار میں الفاظ کا وبنا کثرت سے ہے مگر ایسے اسقام بڑے بڑے مشہور شعراء کے کلام میں بھی ہیں۔ لہذا حضرت موصوف کا کلام ہر طرح قابلِ تحسین ہے خدائے تعالیٰ آپ کے دل و دماغ میں زیادہ قوت دے۔ امید کی جاتی ہے کہ ایسی فروگزاشتیں چند روز بعد خود بخود بہ اصلاح ہو جائینگی، کیونکہ آپ ذہین اور فطین ہیں، اور موجودہ حالت میں بھی اچھے اچھے شعراء سے اچھے ہیں ع

اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

دفتر ادیب الہ آباد
اکتوبر ۱۹۱۱ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مناجات

اے کُل جہاں کے خالق ہر شئے بنانیوالے
نیرنگیوں سے بزم ہستی سجانیوالے

وہم وگمان پائیں کیا آن بان تیری
اِس سے بہت زیادہ اونچی ہے شان تیری

آتا نظر نہیں ہے گو آستان تیرا
لیکن بنا ہے سب کے دل میں مکان تیرا

قدرت کے ہیں کرشمے ہر سو تیری ہویدا
جلوہ ہے تیرا سب میں جو کچھ ہوا ہے پیدا

ہر ایک کو عطا کی اک شان خاص تو نے
رکھا ہر اک طبیعت میں اختصاص تو نے

جس دل کو جیسا چاہا اُس رنگ کا بنایا
اِک موم کا بنایا اِک سنگ کا بنایا

عُشّاق کو دیا ہے سوز و گُداز تُو نے
بخشے ہیں مہوشوں کو انداز و ناز تُو نے

اِک بندۂ رضا ہے جاندادۂ وفا ہے
اک بانیِ ستم ہے آمادۂ جفا ہے

بُلبل کو گلستاں میں آہ و فغاں ملی ہے
پا کر ہنسی چمن کی ہر اِک کلی کِھلی ہے

دی سرو کو بلندی۔ نرگس کو چشمِ حیراں
لالہ نے داغ پایا سنبل نے زُلفِ پیچاں

سبزے کو کر دیا ہے خوابیدہ سو رہا ہی — گریاں اُسے بنایا ہی۔ ابر رو رہا ہے

پرواز پا کے خوش ہیں اونچی اُڑان والے — اپنے کو جانتے ہیں وہ آسمان والے

پروانہ کو ہوا ہے سوزِ دروں عنایت — سینہ میں رکھدیا ہے اُسکے شرارِ اُلفت

رکھا ہے شمعِ محفل کو تو نے وقفِ زاری — رہتی ہے صبح تک وہ مصروفِ اشکباری

مجھکو عطا ہوا ہے دردِ نہاں جگر میں — شوریدگی کا سودا رکھا گیا ہے سر میں

بخشی دعا کو تو نے تاثیر یاالٰہی
میری بھی اب بدلدے تقدیر یاالٰہی

اے کارسازِ عالم۔ بگڑی بنانے والے — ہر اک بُری بَلی سے مجھکو بچانے والے

اس دل کی الجھنوں سے مجھکو نجات دیدے — اس زندگی سے اچھی اور اک حیات دیدے

ان بیقراریوں سے اس فرطِ غم سے چھوٹوں — ان آہ و زاریوں سے درد و الم سے چھوٹوں

بیتابیوں سے مجھکو یارب سکون ہو جائے — میری رگوں میں پیدا اک اور خون ہو جائے

یہ اضطرابیِ دل مجھکو نہ پھر ستائے — یہ بیکلی نہ مجھکو پھر آکے مُنہ دکھائے

مجھ پر پڑے نہ سایہ نیرنگیِ جہاں کا — چلنے نہ پائے مجھ پر کچھ زور آسماں کا

ہو گردشِ زمانہ سے بال تک نہ بیکا — دشمن بنے نہ کوئی میرا نہ میں کسی کا

پُر امن زندگی ہو آرام سے بسر ہو — جھگڑا کسی طرح کا ہو اور نہ شور و شر ہو

صنّاعیوں کو یارب فطرت کی جا کے دیکھوں — دشت و جبل میں شوکت قدرت کی جا کے دیکھوں

تو دوں میں برف کے ہو کوہِ بلور کا لطف — موسیٰ کی طرح مجھکو حاصل ہو طور کا لطف

وہ چوڑے چکلے دریا چاندی بہانیوالے
ہوں اپنی سینری پر مجھکو لٹانیوالے

وہ شام کو شفق کی ہلکی گلابی رنگت
وہ بدلیوں کا منظر وہ اُنکی آبی رنگت

دامن میں اپنے تاروں کو شب کا لیکے آنا
اُن کا چمک دمک کر دل کو مرے لبھانا

وہ صبح کو اُفق سے خورشید کا نکلنا
کرنوں کا اُسکی آکر گر پڑنا اور مچلنا

دلچسپ کسقدر ہیں اور جانفزا یہ منظر
لُطف ان سے ہو اُٹھانا یارب مجھے میسّر

کرے قبول یارب ارشد کی یہ دعائیں
ہونے نپائیں رد اب ارشد کی یہ دعائیں

فلسفۂ اتحاد

یورپ کا مشہور شاعر شیلے کہتا ہے "دُنیا میں کوئی چیز اکیلی نہیں"
"تمام چیزیں ایک قانون الٰہی سے ایک دوسرے کی ہستی میں مل جاتی ہیں"
اشعار مندرجہ ذیل اسی فلسفی شاعر کے زبردست خیالات کی امداد سے ترتیب دئے گئے ہیں۔

اے کہ مہجوریِ عشاق روا میداری
بندگاں راز بر خویش جدا میداری

چاند کی کرنیں سمندر میں گرا کرتی ہیں
جوشِ اُلفت میں اُسے چوم لیا کرتی ہیں

جلوہ گر شرق سے ہوتا ہے جو مہر انور
روشنی اُسکی لپٹتی ہے زمیں سے آکر

ابر سے پانی برستا ہے جو قطرہ قطرہ
افتراق اسکا بھی مٹ جاتا ہے رفتہ رفتہ
چشمے بہ بہ کے ہوا کرتے ہیں ضم دریا میں
موجیں ہوتی ہیں بغلگیر بہم دریا میں

پھول گلشن میں جو کھلتے ہیں الگ شاخوں پر
جھوما کرتے ہیں سحر کو وہ گلے مل مل کر
روز پروان جو یہ چڑھتا چلا جاتا ہے
سرو سورج کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے

کچھ ہوا ایسی چمن کی ہے دلِ بلبل میں
خوفِ صیاد نہیں شوق لقائے گل میں
گرمیِ حسن سے گو اسکی جلے جاتے ہیں
پھر بھی پروانے سوئے شمع چلے جاتے ہیں

مختلف سمتوں سے چلتی ہیں ہوائیں جتنی
شوق میں آکے وہ آپس میں ہیں ملتی جلتی
ناز کرتے ہیں پہاڑ اپنی فلک بوسی پر
آسماں کرتا ہے اظہار نوازش جھک کر

گھاس کی پتیاں ہیں کاہ ربا سے چمٹی
لوہے کو کھینچتی ہے قوتِ مقناطیسی
برق گرتی ہے جو پانی میں تو رہ جاتی ہے
پھر پلٹ کر کبھی اس میں سے نہیں آتی ہے

ہستیاں یونہی ہوا کرتی ہیں باہم یکذات
اپنے مطلوب سے ملجاتی ہے کل مخلوقات
ایک سے دوسرا ملتا رہے فطرت ہے یہی
کشش و جذب کی دنیا میں حقیقت ہے یہی

ہائے پھر آپ کا یوں مجھ سے جدا ہو جانا
میری تقدیر کا ہے مجھ سے خفا ہو جانا

سوزِ پنہاں

تپشِ دل نے عجب شان بنا رکھی ہے
آتش افروزیِ الفت سے جلا جاتا ہوں
ایسے احرار بھی ہو جاتے ہیں انسانوں میں

شررِ عشق نے اک آگ لگا رکھی ہے
یعنی نذرِ غمِ جانسوز ہوا جاتا ہوں
گرمیِ حسن کی تاثیر ہے ان شانوں میں

آہ کیسا یہ نکلتا ہے مرے منہ سے دھواں
فرطِ سوزش سے ہوئے آبلے پیدا دل میں
ایک دریا ہے رواں آٹھ پہر آنکھوں سے

پھونکے دیتا ہے کلیجہ مرا سوزِ پنہاں
شمع کی طرح گدازی ہے مجھے محفل میں
خون بن بن کے ٹپکتا ہے جگر آنکھوں سے

نہ رہا سوزِ دروں شعلۂ پنہاں ہو کر
ہمہ تن داغ ہوں داغوں سے نمایاں ہوں میں
کوئی دنیا میں نہیں سوختہ قسمت مجھ سا

پردہ پردہ میں چراغِ تہِ داماں ہو کر
چشمِ ناظر کے لئے سرو چراغاں ہوں میں
نظر آتا نہیں افروختہ قسمت مجھ سا

آہ کیا برق نگاہی کا تماشا ہے یہی
جل بجھے دیکھنے والا بھی تقاضا ہے یہی

آگ سینہ میں لگے منہ سے مگر اُف نہ کرے
ہاتھ تک جان سے دھو بیٹھے تاسف نہ کرے

اقتضا ضبط کا گو مانعِ گویائی ہے
چھالے بن کر مرے ہونٹوں پہ فغاں آئی ہے

شرحِ ایں آتشِ جانسوز نگفتن تا کے
سوختم سوختم ایں سوز نہفتن تا کے

دوست کو پیام

یہ عطا کیا ہے تم نے مجھے سوز و ساز کیسا
مرے دل میں بھر دیا ہے غمِ جانگداز کیسا

یہ کشاکشِ تمنا یہ امیدِ کامیابی
یہ تخیلاتِ باطل یہ نمودِ اضطرابی

یہ خلش یہ دردِ پنہاں یہ تڑپ یہ آہ و زاری
یہ ہجومِ آرزو کا یہ وفورِ بیقراری

کبھی بیمِ نامرادی کبھی اشتیاقِ عشرت
کبھی ذوقِ سازگاری کبھی خوفِ یاس و حسرت

کبھی محوِ شادمانی کبھی سوزِ دل سے گریاں
کبھی خود بخود فسردہ کبھی خود بخود پریشاں

کبھی شاکیِ زمانہ کبھی شکوہ سنجِ قسمت
کبھی واصفِ محبت کبھی نکتہ چینِ الفت

نہ ہے چین لمحہ بھر کو نہ سکون ایک دم کو
نہ قرار ہے خوشی کو نہ قیام ہے الم کو

تمھیں لطف کیا ملا ہے مری بیکلی سے آخر
تمھیں ہاتھ آ گیا کیا مری بیدلی سے آخر

مرے دل میں تھی تمنا۔ مرے دل کا مدعا تھا — مرے دل کی آرزو تھی مرا دل یہ چاہتا تھا
تمھیں مجھ پہ رحم آتا مجھے تم بھی پیار کرتے — مرے شیوۂ وفا کو بھی تم اختیار کرتے
مرے دل کا درد سنتے مرے چارہ ساز ہوتے — مری غمگساری کرتے مرے دلنواز ہوتے
نہ میں اسطرح تڑپتا نہ میں بیقرار ہوتا — نہ یہ اضطراب ہوتا نہ یہ انتشار ہوتا
مری چشم خونچکاں سے نہ لہو ہی یوں ٹپکتا — نہ جگر میں آگ لگتی نہ یہ شعلہ یوں بھڑکتا
مجھے کیوں جلا رہے ہو مجھے کیوں ستا رہے ہو — مرے نقش زندگانی کو عبث مٹا رہے ہو
تمھیں منصفی سے کہہ دو یہ ہے طرز ناز کیسا — میں نیاز مند ہوں گر تو پھر احتراز کیسا

مرے زخم دل کا کچھ تو کبھی التیام ہو جائے
مرے درد و غم کا اب تو کہیں اختتام ہو جائے

ترانۂ محبت

(مغربی خیالات کا اقتباس)

جس طرح سمندر کی لہریں ساحل پر سیپ اچھالتی ہیں
اور بحر میں کرنیں سورج کی اک نور کی چادر ڈالتی ہیں
یا جیسے فصل بہار گل میں بلبل نغمہ سناتا ہے
دل میرا جذب محبت سے یوں تیری طرف کھنچ جاتا ہے

یا جیسے نور سے تاریکی اور رات سے دن ہوتا ہی بہم
یا جیسے مل کر پھولوں کو کرتی ہے تر و تازہ شبنم
یا بیل درختِ پیچاں کی مینارے پر چھا جاتی ہے
ملنے کو تجھ سے روح مری بس جوش میں یونہی آتی ہو

ہوتا ہے مگر تنہا ہی قمر بیمہری سے جلوہ گستر
یا ایک چٹانی غار نہیں آنے دیتا لہروں کو ادھر
ایسے ہی تیرا جوشِ غضب مجھکو بھی دور ہی رکھتا ہے
اس حسن کو تیرے رعب ترا گویا مستور ہی رکھتا ہے

جس ظلم سے اور بیرحمی سے یہ رات کا بے پروا پالا
مرجھا کر نازک پھولوں کو کر دیتا ہے رنگ اُن کا کالا
یا جیسے شاہوں کو خنجر کر دیتا ہے دم میں زیرِ خاک
ایسے ہی تیرا جور و ستم مجھکو بھی کئے دیتا ہے ہلاک

گو تجھکو نہ ہو پروا میری یا مجھسے تجھکو نفرت ہے
پر میری رگ رگ کے اندر اُلفت ہے اور محبت ہے

گو طرزِ تغافل سے تیرے میں وقفِ الم ہی رہتا ہوں
پر یوں ہی کہوں گا آیندہ اور اب بھی یہی میں کہتا ہوں

تیرا ہی عاشقِ شیدا ہوں تیرا ہی چاہنے والا ہوں
بس تیرا ہی متوالا ہوں ہاں تیرا ہی متوالا ہوں
تجھ سے ہی مجھکو اُلفت ہے دم تیرا ہی میں بھرتا ہوں
ہر حال میں تجھپر مفتوں ہوں جیتا ہوں یا میں مرتا ہوں

خاطرِ مایوس

دلکشا قصرِ تمنا تیرا ہر اک باب ہے
واہ کیا پیارا تخیل کیا مزے کا خواب ہے

اے گلستانِ تصور تو بھی کیا شاداب ہے
یہ اگر سچ ہو تو جنت عالمِ اسباب ہے

مرتے دم تک دلکشیِ زندگانی ہے یہی
سچ اگر پوچھو حیاتِ جاودانی ہے یہی

آہ ناوابستگیہائے دلِ ناپروردۂ غم
سادہ لوحیِ دلِ نادیدۂ رنج و الم

سادگیہائے دلِ ناآشنائے فکر و ہم
ناشناسیِ دلِ ناواقفِ جور و ستم

حُسنِ عالم سوز کا یہ بھی تماشائی ہوا

"بہترینِ آفرینش" کا تمنائی ہوا

آہ! اُمیدِ حصولِ روزگارِ آرزو — دلفریبی ہائے لطفِ انتظارِ آرزو
خواہشِ نظّارگیِ جلوہ زارِ آرزو — اشتیاقِ دیدِ روئے گلعذارِ آرزو

وہ خیالاتِ طرازیِ جہانِ انبساط
وہ تصور ہائے نیرنگِ زمانِ انبساط

ہم نشینی ہم زبانی کا تصوّر رات دن — گلفشانی خوش بیانی کا تصوّر رات دن
اسطرح کی زندگانی کا تصوّر رات دن — لطفِ آغازِ جوانی کا تصوّر رات دن

جھینپے جھینپنے سے وہ اندازِ تکلّم کا خیال
دل لگی کا مسکرانے کا تبسّم کا خیال

عارضِ پُر نور جن پر شمعِ ایماں کا گماں — آنوالے تا کمر وہ گیسوئے عنبر فشاں
وہ جبینِ صاف گویا صبحِ صادق ہو عیاں — وہ دہانِ تنگ رشکِ غنچہ ہائے بوستاں

اک سراپائے وفا ناز آفرینِ عشوہ طراز
مستتر ہر ہر ادا میں جسکی شانِ امتیاز

وہ بھی اک تصویرِ اُلفت وہ بھی اک برقِ شرار — غنچۂ خوبی مگر غیرت دہِ عشقِ ہزار
شمعِ بزمِ حسن لیکن سوزِ دل سے اشکبار — سوختہ جانِ محبت کے لئے پروانہ وار

فلسفہ دانِ محبت واقفِ سرِّ نہاں
اتحادِ جوشِ الفت سے لبانِ جسم جاں

اضطرابِ شوق اب تابِ شکیبائی نہیں — طاقتِ صبر و سکوں اے حسنِ یکتائی نہیں
سامنے کیوں اب تک اوطرزِ خود آرائی نہیں — بہرہ مند انوار سے چشمِ تماشائی نہیں

آرزوؤں سے تمناؤں سے ارماں ہیں ہم
یا خدا نا خواستہ اُمید و حرماں ہیں ہم

آہ فرطِ آرزو بیکار ہی جائے گی کیا — یہ تمنا بن کے حسرت خوں رُلائیگی کیا
رنگ میری بدنصیبی کچھ نیا لائے گی کیا — میرے ارمانوں پر آخر مُردنی چھائیگی کیا

آہ کیا ہو جائیگا سچا یہ میرا احتمال
بس زیادہ دے نہ دھوکے مجھکو نیرنگِ خیال

آہ یہ تو ہیں مرے آغازِ الفت کا سماں — آہ یہ تو ابتدائے شوق کی ہیں سرخیاں
آہ یہ تو ہیں مری گذری ہوئی دلچسپیاں — آہ یہ تو ہیں مری پہلی خیالی بستیاں

باغِ دل میں جبکہ آئی تھی بہارِ آرزو
اور میں تھا عندلیبِ شاخسارِ آرزو

شانِ استغنائیِ جاناں کسے معلوم تھی — نامرادیِ دلِ ناداں کسے معلوم تھی
شورہ بختیِ تمنائستاں کسے معلوم تھی — یہ روش اے گردشِ دوراں کسے معلوم تھی

آہ اے گردونِ گرداں آہ اے دورِ زماں

آہ نیرنگیٔ دہر وانقلابِ آسماں

آہ وہ میری اُمنگیں وہ اُمیدوں کا وفور
وہ تمناؤں کا مجمع حسرت و حرماں سے دور

اضطرابِ شوق میں جوشِ طبیعت کا ظہور
ہلکا ہلکا بادۂ جامِ محبت کا سرور

آہ وہ شوقِ نظارا آہ وہ ذوقِ جمال
آہ وہ لطفِ تصوّر آہ وہ حسنِ خیال

مٹ گئے وہ داغہائے پرشرارِ حسن و عشق
اُڑ گئے گلہائے باغِ نوبہارِ حسن و عشق

ہو گیا تصویرِ حسرت بیقرارِ حسن و عشق
یاس نے رکھا نہ ارشد زیر بارِ حسن و عشق

اب کہاں وہ جامِ کیفِ خوشگوارِ آرزو
اب کہاں وہ سرخوشی ہائے خمارِ آرزو

بیانِ آرزو

یا الٰہی کیا ہوئی وہ میری شانِ آرزو
اب کہاں جاتی رہی وہ اینِ و آنِ آرزو

وہ مری شامِ تمنّا وہ مری صبحِ اُمید
وہ مرے اوقاتِ فرصت وہ زمانِ آرزو

اشتیاقِ منزلِ مقصود و جوشِ اضطراب
وسعتِ دشتِ خیال و کاروانِ آرزو

وہ تبسم خیز موجیں بحرِ حُسنِ فکر کی
کشتیٔ دل اور اُس پر بادبانِ آرزو

کامیابی کی وفورِ شوق میں خوش منظری
جو مدارِ زندگی تھی اور جانِ آرزو

سازگاریِ مقدر کا وہ لطفِ انتظار
یعنی اک کیفیتِ رازِ نہانِ آرزو

ہاں مگر محرومیِ قسمت کا تھا یہ انتخاب
اک متاعِ داغ ہے سود و زیانِ آرزو

آہ اے ناکامیِ جاوید یہ کیا کر دیا
ہو کے بے بس رہ گیا اک ناتوانِ آرزو

آگئی بزمِ تمنا پر قیامت آگئی
گر پڑا ہے ٹوٹ کر اک آسمانِ آرزو

انتہائے یاس نے سکتہ کا عالم کر دیا
محشرستانِ تحیر ہے جہانِ آرزو

کیسی کیسی حسرتوں کا خوں ہوا ہے کیا کہوں
شرحِ دردِ غم ہے میری داستانِ آرزو

وہ امیدیں وہ امنگیں وہ تمنائیں وہ شوق
دل سے کیونکر مٹ گیا اک اک نشانِ آرزو

نامرادی نے کیا ہے اسقدر پستی نصیب
وہم سے بھی ہو گیا بالا گمانِ آرزو

دائمی افسردگی چھائی ہوئی ہے ہر طرف
بنگیا جوشِ طرب بھی ہم عنانِ آرزو

خارزارِ حسرت و حرماں دلِ پژمردہ ہے
ہو گیا صرفِ خزاں یہ بوستانِ آرزو

اس ہجومِ یاس میں بھی لے دلِ خمیازہ کش
اور باقی ہے ابھی کچھ امتحانِ آرزو

آہ عالم ناامیدی کا بھی کیا تاریک ہے
اب کہاں وہ پرتوئے حسنِ عیانِ آرزو

اب کہاں وہ دلفریبی اور وہ دلبستگی
اب کہاں وہ دلکشیِ جاودانِ آرزو

خانۂ خالی میں ویرانی ہے کیا چھائی ہوئی
ہائے میرا دل کبھی تھا میزبانِ آرزو

نارسائیِ مقدر سے مٹا جاتا ہے یہ
آہ شوقِ جبہ سائے آستانِ آرزو

کر دیا تصویرِ حیرت فرطِ حسرت نے مجھے
اب کہاں وہ گرمیٔ حسنِ بیانِ آرزو

سوزشِ پنہاں کا لب تک آ نہیں سکتا گلہ
شمع کی مانند جلتی ہے زبانِ آرزو

پھر بھی اس لطفِ خلش کو کیا کہوں کیا کچھ ہے یہ
دل میں چبھ کر رہ گئی نوکِ سنانِ آرزو

مرتے مرتے بھی نہیں جاتی ہیں یہ دلچسپیاں
ایسے لذت گیر ہیں دلدادگانِ آرزو

نا امیدی میں بھی ہوں امیدوارِ آرزو
آہ کچھ پوچھو نہ ذوقِ انتظارِ آرزو

دیدے یارب پھر وہی لیل و نہارِ آرزو
گردشِ ایام لادے روزگارِ آرزو

پھر کہیں سے مجھکو ملجائے مرا عہدِ عتیق
جس نے دے رکھا تھا مجھکو افتخارِ آرزو

اخترِ قسمت چمک جائے پھر آئیں میرے دن
نور افگن ہو وہی شمس النہارِ آرزو

پھر ہری ہو کر پھلے پھولے مری کشتِ امید
گلشنِ دل میں پھر آجائے بہارِ آرزو

پھر مرے دل میں تمناؤں کی ہو بزمِ نشاط
پھر وہی جوشِ طرب جو ہے شعارِ آرزو

پھر وہی سرمستی و وجدانِ بزمِ بیخودی
پھر وہی جامِ شرابِ خوشگوارِ آرزو

یاد ہیں وہ ابتدائے شوق کی کیفیتیں
چاہتا ہوں پھر وہی ارشد خمارِ آرزو

میری عید

دن عید کا ہے آج نیا رنگِ جہاں ہے
چھایا ہوا ہر سمت مسرت کا سماں ہے

پھرتی ہے خوشی چار طرف رقص کناں آج
آتا ہے نظر شاد ہر اک پیر و جواں آج

چہروں پہ بشاشت ہے لبوں پر ہے تبسم
کانوں میں ہے آوازۂ عشرت کا ترنم

بچوں کی مسرت ہے عیاں شور و شغب سے
وہ پھولے سماتے نہیں افراطِ طرب سے

کلفت کا زمانہ میں نہیں نام و نشاں تک
اندوہ کا شمہ بھی نہیں وہم و گماں تک

عشاق کا بھی غنچۂ دل آج کھلا ہے
اب جور کا شکوہ نہ تغافل کا گلا ہے

کہتی ہے تمناؤں سے اُمید مبارک
ہو عید کے ہمراہ تمہیں دید مبارک

عذرات وفاؤں کے قدم چوم رہی ہیں
مل مل کے گلے دونوں ہم جھوم رہی ہیں

اک میں ہوں کہ ہوں آج بھی افسردہ و دلگیر
سب عیش کی تصویریں ہیں میں رنج کی تصویر

آنکھوں میں وہی اشک وہی لب پہ فغاں ہے
دل میں ہے وہی درد وہی سوزِ نہاں ہے

خمیازۂ امید وہی پیشِ نظر ہے
ناکامیِ جاوید وہی پیشِ نظر ہے

آشفتگیِ بخت کا عالم بھی وہی ہے
آہیں ہیں وہی نالۂ پیہم بھی وہی ہے

صدمہ بھی وہی اور وہی جوشِ جنوں ہے
آلام کی کثرت سے وہی حالِ زبوں ہے

اندازۂ شوریدہ سری بھی ہے وہی آج
پہلو میں گدازِ جگری بھی ہے وہی آج

ہے اب بھی وہی صورتِ زیبائش مژگاں
ٹکڑے جگر و دل کے ہیں آرائش مژگاں

ویسا ہی حزیں اب بھی ہوں لب خشک ہیں رخ زرد
رہ رہ کے وہی بھرتا ہوں میں اب بھی دم سرد

نالوں میں ہے تاثیر نہ آہوں میں اثر ہے
نیرنگیِ قسمت سے وہی شام و سحر ہے

نومیدیِ ما گردشِ ایام ندارد
روزے کہ سیاہ شد سحر و شام ندارد

دلِ ناکام

لطفِ آغازِ محبت کی کہانی کیا کہوں
ہو گئیں باتیں ہی یہ اب تو پرانی کیا کہوں

کس قدر دلکش تھی میری زندگانی کیا کہوں
دل کے وہ جذبات اور شوقِ نہانی کیا کہوں

تھا ہجومِ شوق سے میں بھی تمنائی کبھی
ہاں تصور ہی میں رہتا تھا تماشائی کبھی

تھا کبھی میرے لئے بھی رزگارِ آرزو
مجھکو بھی حاصل تھا لطفِ انتظارِ آرزو

جوشِ دل سے ہو نہ سکتا تھا شمارِ آرزو
آرزو مجھ پر فدا تھی میں نثارِ آرزو

مخزنِ صد آرزو میرا دلِ ناکام تھا
ناامیدی میرے آگے ایک فرضی نام تھا

بزمِ مینوشاں میں میرا بھی کبھی مذکور تھا
میں بھی کیفِ جامِ اُلفت سے کبھی مسرور تھا
میری قسمت میں بھی یہ افسردۂ انگور تھا
میں بھی صہبائے محبّت سے کبھی مخمور تھا

ملتفت پیرِ مغاں تھا دَور میں پیمانہ تھا
میں بھی تھا میکش کبھی مشرب مرا رندانہ تھا

آہ تھا میرا زمانہ بھی کبھی دورِ نشاط
آہ شوقِ گرمجوشی آہ ذوقِ ارتباط
اور مستقبل نظر آتا تھا پر از انبساط
وہ تمنّائے تکلّم آرزوئے اختلاط

مجھ سے پوچھے کوئی اُس اُمیدِ عشرت کے مزے
وہ وفورِ شوق وہ فرطِ مسرّت کے مزے

کیا خبر تھی یوں بھی نیرنگِ جہاں ہوجائیگا
ایکدم سے منقلب دورِ زماں ہوجائیگا
اس طرح کا انقلابِ ناگہاں ہوجائیگا
اپنے ارمانوں کا دشمن آسماں ہوجائیگا

اوس پڑ جائیگی میرے گلشنِ اُمید پر
حسرتیں روئیں گی اس ناکامیِ جاوید پر

میں سمجھتا تھا کہ ہیں میرے لئے امکانِ عیش
میں بھی کرلونگا فراہم ایکدن سامانِ عیش
دستِ کوشش سے پکڑ سکتا ہوں میں دامانِ عیش
کیا کہوں دل میں تھے کیا کیا کچھ مرے ارمانِ عیش

آہ۔ گوناگونیاں میرے دلِ ناکام کی
آہ بوقلمونیاں آغازِ بد انجام کی

وہ سہانی شام میری رات وہ تاروں بھری
صبحِ صادق کو افق سے مہر کی جلوہ گری

کیسی کچھ خوش خبریاں دیتی تھی یہ خوش منظری
وہ طبیعت کی اُمنگیں اور شگفتہ خاطری

آہ یہ کیا ہو گیا وہ دن وہ راتیں اب کہاں
وہ تخیّل وہ تصوّر اور وہ باتیں اب کہاں

آہ یہ کیا کر دیا اے گنبدِ نیلوفری
آہ گردش کی یہ کیسی تو نے چرخِ چنبری
آہ کیسا رنگ لائی مری بد اختری
آہ کیسی جل گئی اُمید کی کھیتی ہری

اب کہاں وہ دلفریبی ہائے اُلفت کے مزے
اب کہاں وہ دلکشی ہائے محبت کے مزے

آہ وہ دل جو کہ شیدائے رُخِ پُر نور تھا
آہ وہ دل جو کبھی رشکِ چراغِ طور تھا
آہ وہ دل بادۂ اُلفت سے جو مخمور تھا
آہ وہ دل جسکے ہاتھوں میں بہت مجبور تھا

آہ وہ دل جو کہ اُمیدوں کا اک کاشانہ تھا
آخرش دیکھا تو ارمانوں کا زنداں خانہ تھا

وہ تصوّر کا کسی کے مشغلہ جاتا رہا
گیسوئے پُر پیچ و خم کا سلسلہ جاتا رہا
وہ تمنّا مٹ گئی وہ حوصلہ جاتا رہا
رہ گئی حسرت ہی حسرت ولولہ جاتا رہا

اب ہجومِ یاس ہے اور کثرتِ آلام ہے
میں ہوں ارشدؔ اور اک میرا دلِ ناکام ہے

صیدِ تمنّا

وہ صبحِ مسرّت وہ مری شامِ تمنّا — کیا ہو گئے "ہے ہے" مرے ایّامِ تمنّا

تھیں آرزوئیں چار طرف سے مجھے گھیرے — ہر وقت زباں پر تھا مری نامِ تمنّا

ارمان ہزاروں ہی بھرے رہتے تھے دل میں — لبریز خوشی سے تھا مرا جامِ تمنّا

آتی تھیں طبیعت میں اُمنگیں مرے کیا کیا — کیا حوصلے رکھتا تھا میں ہنگامِ تمنّا

کیفیتیں حاصل تھیں مجھے خود بخود ایسی — تھا جرعہ کشِ بادۂ گلفامِ تمنّا

ہمّت کی بلندی سے سمجھتا نہ تھا میں کچھ — اونچا نظر آتا نہ تھا کچھ بامِ تمنّا

یہ جانتا تھا کاتبِ قسّامِ ازل نے — قسمت میں لکھا ہے مری آرامِ تمنّا

تھی شیخ سے رغبت نہ برہمن سے تھا کچھ بیر — تھے کعبۂ دل میں مرے اصنامِ تمنّا

تھا شاہدِ اُمید کا جلوہ طرب افزا — خاطر میں نہ آتے کبھی آلامِ تمنّا

ہر پہلوئے نازک تھا مرے ذہن نشیں سا — عائد کوئی ہوتا نہ تھا الزامِ تمنّا

ناکامیِ قسمت کی مگر تھی نہ خبر کچھ — معلوم نہ تھا ہوگا یہ انجامِ تمنّا

آشفتگیِ بخت دکھائے گی دنِ ایسا — ہو جاؤں گا یوں کشتۂ صمصامِ تمنّا

یوں شوق مبدّل نہ ہو حسرت سے کسی کا — دُنیا میں نہ ہو یوں کوئی ناکامِ تمنّا

اس بیکسی و درد سے دے جان نہ کوئی — پھانسے نہ کسی کو طمعِ خامِ تمنّا

ارشدؔ جو غمِ یاس سے دم توڑ رہا ہے
اک طائرِ بسمل ہے تہِ دامِ تمنّا

افسردۂ خاموش

اک دم سے ہائیں یہ تری حالت کو کیا ہوا
کیا ہو گیا ہے کیوں یہ ترا چہرہ زرد ہے
مردِ خدا بتا تو سہی کیا خیال ہے
چُپ سادھنی یہ تیری مروت سے دور ہے

ارشدؔ شگفتگیِ طبیعت کو کیا ہوا
خاموش کیوں ہی ہونٹوں پہ کیوں آہ سرد ہے
کچھ مُنہ سے بول کس لئے اتنا ملال ہے
احباب کو تو حال بتانا ضرور ہے

عمرِ دو روزہ قابلِ سوز و گداز نیست
ایں رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست

اے ہم نشیں نہ پوچھ مری داستانِ غم
ہم کشتگانِ یاس کا حالِ زبوں نہ پوچھ
واماندگانِ عشق کی درماندگی نہ سُن
سوزِ تپِ فراق کی حالت نہ پوچھ تو

ہو مبتلائے رنج نہ سُنکر بیانِ غم
پھونکا ہے جس نے دلکو وہ سوزِ دروں نہ پوچھ
آشفتگانِ بخت کی ناسازگی نہ سُن
ناکامِ اشتیاق کی حالت نہ پوچھ تو

ناشادو نامراد کی مت پوچھ سرگذشت
اُفتادہ فتاد کی مت پوچھ سرگذشت

مارا ہوا ہوں میں ستمِ روزگار کا
نیرنگیِ فلک کا ستایا ہوا ہوں میں
خوں کردۂ اُمیدِ دلِ ناصبور ہوں
آشفتگیِ بخت سے ناسازگار ہوں

پیسا ہوا ہوں گردشِ لیل و نہار کا
قسمت کی اُلجھنوں کا پھنسایا ہوا ہوں میں
گم کردہ راہ منزلِ مقصد سے دور ہوں
باغِ خزاں رسیدۂ قبل از بہار ہوں

ناکام آرزوئے جمالِ حبیب ہوں
میں ابتدائے شوق میں حرماں نصیب ہوں

مانوس درد و غم سے الم سے فغاں سے ہوں
پھرتا نہیں ہوں گلشنِ شاداب میں کبھی
صحرا سے ہی لگاؤ نہ صحنِ چمن کا شوق
ہنگامہ زارِ ہستی سے بالکل نفور ہوں

مایوس زندگی سے ہوں آزردہ جاں سے ہوں
جاتا نہیں ہوں مجمعِ احباب میں کبھی
خلوت کا خواستگار نہ کچھ انجمن کا ذوق
ہاں اب میں اپنے آپ سے بھی کوسوں دور ہوں

آخر ز راہ و رسمِ جہاں بیخبر شدم
رنگِ زمانہ دیدہ برنگِ دگر شدم

اب سر سے پاؤں تک میں کوئی اور ہو گیا
پہلی سی وہ خیال کی پرواز ہی نہیں
وہ ولولہ وہ جوش وہ ہمت نہیں رہی
چپ چاپ بیٹھا رہتا ہوں تصویر کی طرح

جاتی رہیں وہ باتیں نیا طور ہو گیا
اگلا سا مجھ میں اب کوئی انداز ہی نہیں
وہ میں نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی
باقی نہیں وہ شوخیِ تحریر کی طرح

شد صرفِ سوزِ عشق بیانے کہ داشتم
مانندِ شمع سوختہ زبانے کہ داشتم

پایانِ اُلفت

کیا کہوں میرا عجب حال ہوا جاتا ہے
اب تو جینا مجھے جنجال ہوا جاتا ہے

نہ پراگندہ طبیعت نہ سکونِ دل ہے
بیخودی کہتے ہیں جسکو نہ وہی حاصل ہے

نہ کسی چیز کی خواہش نہ تمنّا کوئی
مدعا ہے کوئی دل کا نہ تقاضا کوئی

ساری دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہیں
مجھکو کچھ عالمِ اسباب میں درکار نہیں

وہ اُمنگیں ہی طبیعت میں نہیں جوش نہیں
الغرض مجھکو کسی بات کا بھی ہوش نہیں

ڈھنگ ہی اب تو نرالا ہے نیا عالم ہے
نہ مسرّت کا اثر ہے نہ وفورِ غم ہے

بولتا بھی نہیں مَیں اور نہ خاموش ہوں میں
کُل بکھیڑوں سے زمانہ کے سبکدوش ہوں میں

نہ کسی حُسنِ دلاویز کی اُلفت باقی
نہ حسینوں سے رہی مجھکو محبّت باقی

شکوۂ جور نہ اظہارِ وفا کوشی ہے
بیقراری بھی نہیں ہے نہ فراموشی ہے

صدمۂ ہجر سے جینا مجھے دشوار نہیں
دلکو کچھ روگ نہیں اب مرے آزار نہیں

مجھکو پروا بھی نہیں گر وہ بُلاتے بھی نہیں
میں تڑپتا بھی نہیں گر وہ ستاتے بھی نہیں

خالِ مشکیں نہیں بنتا ہے سویدا دل میں
اُلجھنیں زُلف سے ہوتی نہیں پیدا دل میں

کوئی اندازِ تغافل بھی مجھے شاق نہیں
بیحجابی کا رُخِ یار کی مشتاق نہیں

اب نہ پیماں شکنی کا مجھے غم ہوتا ہے
کوئی کاوش نہیں ہوتی نہ الم ہوتا ہے

گر تصور میں کبھی وہ مرے آجاتے ہیں — اور گزری ہوئی کو یاد دلا جاتے ہیں
آہ بیساختہ اک منہ سے نکل جاتی ہے — پھر اسی آہ کے کرنے پہ ہنسی آتی ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہوا کیا مجھکو — آپ اپنا نظر آتا ہے تماشا مجھکو
میرا عنواں ہے عجب شان سے زیبِ ہستی — محوِ نظارۂ تصویرِ فریبِ ہستی
نگہِ یاس ہوں میں دیدۂ حیراں ہوں میں — خونِ صد آرزو و حسرت و ارماں ہوں میں
درد دل کا مرے مستغنیِ درماں ہونا — چارہ سازوں کا بتاتا ہے پشیماں ہونا
گزری کیا کچھ مرے دل پہ کوئی کیا جانے — میری قسمت ہی میں چکر ہے کوئی کیا جانے
نہیں معلوم کسی کو مرے دل کی حالت — نہیں معلوم کسی کو بھی مری کیفیت
کیا سبب جانے کوئی میری پریشانی کا — کس نے اندازہ کیا غم کی فراوانی کا
ایسی تاریک نظر آتی ہے دنیا مجھکو — کہ ذرا بھی نہیں جینے کی تمنا مجھکو

ارشد اب اپنے تصور سے بھی بیگانہ ہوں
اور لوگوں نے سمجھ رکھا ہے دیوانہ ہوں

تصویرِ غم

میں ہستی اک افسردہ ہوں — باغِ جہاں میں پژمردہ ہوں
درد ہوں لیکن بے درماں ہوں — مٹ جانے والا ارماں ہوں

حرفِ مروت رنگِ وفا ہوں
خوگیرِ تسلیم و رضا ہوں

خاکِ کوئے الفت ہوں میں
ذرّہ دشتِ محبت ہوں میں

طرزِ چاکِ گریباں ہوں میں
رنگِ خونِ شہیداں ہوں میں

ہوں ناکامِ تمنّا یعنی
بد انجامِ تمنّا یعنی

میری مرادیں کیا بر آئیں
آرزوئیں کیا دل میں سمائیں

غنچۂ دل کیا ہو شگفتہ
میں ہی جب خود ہوں آشفتہ

اُلجھے کیوں نہ طبیعت میری
برگشتہ ہے قسمت میری

محوِ سوز و سازِ غم ہوں
وقفِ فرطِ رنج و الم ہوں

یاس ہے مونس حرماں ہمدم
شغل ہے میرا نالہ پیہم

چین نہیں ہے ایک منٹ بھی
رشتۂ عمر کہیں تو کٹ بھی

جان سے جاؤں غم سے چھوٹوں
روز کے رنج و الم سے چھوٹوں

اس جینے سے مرنا اچھا
جان سے اپنی گزرنا اچھا

زندہ بہرِ رنج و تعب ہوں
نامانوسِ عیش و طرب ہوں

مجھکو مسرت پا نہیں سکتی
مجھکو خوشی بہلا نہیں سکتی

حیراں خامش زار و حزیں ہوں
ہوں ایسا گویا کہ نہیں ہوں

دل ہے سیر جہاں سے اب تو
تنگ ہوں جسم و جاں سے اب تو

زیست سے اپنی آزردہ ہوں
میں تو جیتے جی مردہ ہوں

حُسنِ اجل

روئے پنہاں کا ترے میں بھی ہوں شیدا اے موت — حُسنِ مستور کا ہوں محوِ تمنّا اے موت

تیرے اندازِ خموشی پہ فدا ہوں میں بھی — یعنی دلدادۂ نیرنگِ قضا ہوں میں بھی

چین لینے نہیں دیتی تپشِ دل مجھکو — خون رُلواتی ہے اب تو خلشِ دل مجھکو

طاقتِ زیست نہیں جینے کا یارا ہی نہیں — اور مرنے کے سوا کچھ مجھے چارہ ہی نہیں

اب بہت تجھ سے مجھے شوقِ ہم آغوشی ہے — فارغ الدہر ہوں دُنیا سے فراموشی ہے

مجھکو منّت کشئ اہلِ جہاں راس نہیں — اے اجل تیری عنایت ہے مگر یاس نہیں

تو ہر اک درد و مصیبت سے بچا دیتی ہے — گوشۂ قبر میں خاموش سُلا دیتی ہے

سارے دُنیا کے چھڑا دیتی ہے افکار سے تو — کام کرتی ہے مسیحائی کا بیمار سے تو

جس کا چارہ نہ ہو اُس درد کا درماں ہے تو — جن پہ مشکل ہو جہاں ایسوں پہ آساں ہے تو

بیقراروں کے لئے باعثِ آرام ہے تو — اہلِ فرقت کے لئے شاہدِ گلفام ہے تو

تیرے مفتوں ہیں بد انجام زمانہ بھر کے — تیرے ممنون ہیں ناکام زمانہ بھر کے

کس مپرسی میں ہے سرتاپا نوازش تری ذات — نامرادوں کے لئے مایۂ نازش تری ذات

تو ہے اللہ سے بندوں کو ملانے والی — بے ٹھکانوں کو ٹھکانوں سے لگانیوالی

دیکھ لی روئے منور کی ترے جس نے جھلک — بیخودی نے نہ سنبھلنے دیا پھر حشر تلک

شانِ احسان و کرم اپنی دکھائی تو نے
ہر گرفتار کو بخشی ہے رہائی تو نے

قید تن سے اُسے آزادی جو مل جاتی ہے
روح کس ناز سے اِتراتی ہوئی جاتی ہے

قدر ہوتی ہے ترے آنے سے انسانوں کی
منزلت دیکھیے گزرے ہوئے افسانوں کی

جتنے ہو گزرے ہیں اس دہر میں باکمال
زندگی میں نہ کسی نے بھی کیا اُنکا خیال

بعد مرنے کے وہی عرش کے تارے بنکر
فلکِ عظمت و رفعت پہ ہیں جلوہ گستر

تجھ سے اے موت ہے دُنیا کا تمدن قائم
تو نہ ہو گر تو جہاں ہو ابھی درہم برہم

معتدل عالمِ انسان ہے تیرے دم سے
ہستیٔ مذہب ایمان ہے تیرے دم سے

شمع

اے چراغِ طورِ حسن اے جلوۂ نظارہ سوز
جانِ پروانہ تماشا گاہِ عشقِ عالم فروز

سوختہ جانِ محبت ناظرِ روئے صنم
شمع سوزاں یعنی اے رونق دہِ دیر و حرم

محفلِ عیش و طرب کی شان بالا تجھ سے ہے
تیرگیٔ شامِ غم میں بھی اُجالا تجھ سے ہے

نور افگن بزمِ جاناں میں سدا کرتی ہے تو
جلوہ فرما قصر و ایواں میں ہوا کرتی ہے تو

تیرے دم سے شب کو قائم گرمیٔ بازار ہے
روشنی میں تیری کُل دُنیا کا کاروبار ہے

تیری شانِ جلوہ افروزی ہے نورِ زندگی
روئے پُرتنویر کی عالم میں ہے تابندگی

تو ہے ساتھی منزلِ مقصود تک انساں کی
عالمِ ہُو میں ہے زینت تجھ سے گورستان کی

قبرِ بیکس پر یہ تیری جھلملاتی روشنی
ڈالتی ہے بے ثباتی پر جہاں کی روشنی

آہ۔ اے شمعِ لحد۔ اے رونق افزائے مزار
یہ خموشانِ اجل پر آہ و زاری کس لئے
کیوں گھُلی جاتی ہے فرطِ غم سے اے فانوس تو
کشمکش ہائے جہاں کی اُلجھنوں کو چھوڑ کر
خفتگانِ خاک کی کرتی ہے کیوں تو جستجو
ان کے دل بھی مر گئے اور حسرتیں بھی مر گئیں
تو شروعِ زندگی ہی سے ہی گریہ کناں

مرنیوالوں مٹنے والوں بیکسوں کی سوگوار
جانگدازی سینہ سوزی اشکباری کس لئے
ان عدم کے جانیوالوں سے ہے کیا مانوس تو
آئے ہیں ہنگامہ زارِ دہر سے مُنہ موڑ کر
کشتگانِ یاس سے کس بات کی ہے آرزو
خاک ہو کر سب تمنائیں کنارہ کر گئیں
بعدِ مردن بھی سرِ مرقد ہے خونناب فشاں

ہاں مگر انجامِ ہستی کا تجھے معلوم ہے
ابتدا میں انتہا کے واسطے مغموم ہے

دولت و شہرت

دُنیا کی دولت! دُنیا کی شہرت!
کیا ہیں یہ دونوں بنیادِ عشرت؟
دے سکتی ہیں کیا تم کو یہ راحت؟
کیا ان سے پاؤ گے لطفِ بہجت؟

کیا ان سے حاصل ہوگی مسرت؟ — شاید جواب اس کا دوگے ہاں میں

دنیا میں لیکن شہرت کا سہرا — کتنا ہی پیارا ہو اور اچھا
کیسی ہی خوشبو دے وہ زیادہ — جس سے مشامِ عالم ہو تازہ
آخر ہے اک دن مرجھانے والا — کیا وہ بچے گا فصلِ خزاں میں

یہ مال اسباب یہ سیم یہ زر — یہ سچے موتی لعل و جواہر
یہ بیش قیمت دھات اور پتھر — عمدہ سے عمدہ بہتر سے بہتر
اچھے تو سمجھے جاتے ہیں اکثر — داخل ہے یہ سود لیکن زیاں میں

کرلیں اگر فرض اک شخص ایسا — رکھتا بہت سا ہے وہ خزانہ
شانِ امارت میں بھی ہے یکتا — دیتے ہیں اس سے ادنیٰ و اعلیٰ
آخر کسی دن وہ بھی مرے گا — ہوگی جدائی جسم اور جاں میں

اک مطربہ کی یا شاعرہ کی — شہرت ہے ساری دنیا میں پھیلی
عزت ہے کرتی ہر قوم اس کی — آنکھوں میں دل میں سب نے جگہ دی
ہوگی فنا پر اس کی بھی ہستی — تھی ہی نہیں وہ گویا جہاں میں

قابل مصنف ہے ایک ایسا
زورِ قلم کا جس کے ہے چرچا
مانا گیا ہے بے مثل و یکتا
تحریر اُس کی ہے فخرِ انشا
بکھرے گا پھر بھی شیرازہ اسکا
وقت پڑے گی نام و نشاں میں

دُنیا کی دولت! دُنیا کی شہرت
دُنیا کی عزت! دُنیا کی حرمت
دُنیا کی ثروت! دُنیا کی حشمت
دُنیا کی رفعت! دُنیا کی شوکت
دُنیا کی عظمت! دُنیا کی وقعت
منظر ہیں یہ سب خوابِ گراں میں

وفائے گُل

پیڑ ہے گھر میں گُلِ عباس کا
نام کچھ اُس میں نہیں بو باس کا
گو نہیں دیتا ہے بو مثلِ گلاب
گھر نہیں ہوتا ہے میرا مشکناب
پھر بھی اُس سے لطف اک پاتا ہوں میں
سادگی سے دل کو بہلاتا ہوں میں
گو نہیں تعریف کے قابل ہیں پھول
پر نہیں ہوتا ہے دل میرا ملول
دیکھتا رہتا ہوں میں اُنکی بہار
گھر بنا رہتا ہے میرا لالہ زار
عطر ان کا گو نہیں کھچتا کہیں
ہے مگر تازہ مری جانِ حزیں
ہو نہ بلبل ملتفت ان پر ہزار
میں انہیں کرتا ہوں لیکن دل سے پیار
گو حسیں رکھتے نہیں سر پر انہیں
میں سمجھتا پھر بھی ہوں بہتر انہیں

گو نہیں انکے بناتے لوگ ہار — پھر بھی ہوں سو جان سے میں انپہ نثار

گو بناتے ان کے گلدستے نہیں — ان سے ملبوسات بھی لیتے نہیں

ہیں مگر پھر بھی یہ میرے کام کے — لطف دینے والے صبح و شام کے

میرے دل سے کوئی پوچھے انکی شان — مجھ سے سن لے کوئی انکی آن بان

موگرا - بیلا - چنبیلی - موتیا — بے تکلف ان پہ میں کردوں فدا

سامنے کیا ان کے چمپا کیا گلاب — ہیں یہ دنیا بھر کے پھولوں کا جواب

ساری دنیا سے یہ ہیں مجھکو عزیز — میں سمجھتا ہوں کہ ہیں کیسی چیز

کیوں نہ ہو پودا ہے کس کے ہاتھ کا — ہائے جو کھیلا ہوا تھا ساتھ کا

خاک میں اکبار جاکر مل گیا — پھر نہ اپنا کچھ پتا مجھکو دیا

یہ گلِ عباس بھی ہاں خاک میں — ہر برس جاتا ہے اُسکی تاک میں

فرطِ غم سے زار ہے میری طرح — اشتیاقِ یار ہے میری طرح

یا مجھے فرقت میں پاکر بیقرار — اُس سے کرتا ہے یہ جاکر آشکار

"ہجر میں تیرے نہیں آئندہ کو کل — خاک سے میری طرح تو بھی نکل"

چل تسلّی دے دلِ مہجور کو — شاد کر دے خاطرِ رنجور کو"

خوب واقف ہوں میں اسکے حال سے — دیکھتا ہوں یوں ہی دو سال سے

جب خزاں کا آکے ہوتا ہے اثر — پیڑ - پتے - پھول جاتے ہیں بکھر

جب یہ چھاتا ہے زمانہ پر سماں — پیڑ ہو جاتا ہے مٹی میں نہاں

دیکھتا ہے پھر وہاں یہ انتظار — میں بھی نکلوں کاش آ جائے بہار

یہ بگڑتا اسکا پھر بنجاتا ہے — ہائے کیا انداز معشوقانا ہے

جب خزاں جاکر پھر آتی ہے بہار — تب نکلتا ہے یہ بعد از انتظار

اسکو ہے مصداق ہونا بیش و کم — "ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام"

الغرض جو کچھ بھی ہو یہ خوب ہے — یہ مرا پودا مجھے مرغوب ہے

ہے سراپا خوگرِ مہر و وفا — بھولتا مجھکو نہیں بعد فنا

شاد اس سے خاطرِ مغموم ہے
یہہ نشانِ مشفقِ مرحوم ہے

دشتِ غربت

دشتِ غربت میں مسافر کو وطن یاد آیا

ستمبر ۱۹۱۵ء کے اصلاحِ سخن میں تصویرِ ریاض اور جناب مظہر تھانوی و عیش وغیرہ کی غزلیات پرانی صحبتوں کی دلچسپیاں یاد دلانے کا باعث ہوئیں۔ برسوں بعد تخیل نے وطن کی گزشتہ پرلطف سیروں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا اُسی زمانہ میں کسی دوست نے ایک شعر کہا تھا ؎

ہم ہیں تھانہ بھون کی گلمیاں ہیں
یار لوگوں کی رنگ رلیاں ہیں

مگر مدت ہوئی یارلوگوں کا یہ مجمع منتشر ہوگیا۔ البتہ دلوں پر تصویریں کھچی ہوئی ہیں۔

یہ صورت حسرم میں جڑی ہی رہ گئی

فکرِ موزوں نے اُس واپس نہ آنے والے منظر کی طرف سرسری نظریں دوڑائی ہیں اور حُبِ وطن کے جذبات کو نظم کی صورت میں ظاہر کیا ہے۔ اشعار ذیل اس تمہید کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسی خاص نقطۂ نگاہ سے دیکھے جانے کے مستحق ہیں۔

اِو وطن کی سرزمیں او خطۂ رشکِ چمن | رو کشِ فردوس یعنی قصبۂ تھانہ بھون

او مری طفلی کی دنیا میرے بچپن کے جہاں | میرے جانے میرے بوجھے اور زمین و آسماں

جب رہا کرتا تھا تجھ میں کسقدر دلشاد تھا | میں زمانہ بھر کی ہر اک فکر سے آزاد تھا

وہ ترے شاداب جنگل وہ ترے سرسبز باغ | پُر فضا وہ تیری بستی جسمیں حاصل تھا فراغ

تیری گلیوں میں عجب ملتی تھی فرحت اُن دِنوں | ساری دُنیا سے فزوں تھی تیری وسعت اُن دنوں

تیرے دامن میں تری گودوں میں بڑھتا بھی رہا | کھیلتا بھی۔ کودتا بھی اور پڑھتا بھی رہا

رفتہ رفتہ ایک منظر اور دلکش آگیا | کیا سماں تھا جس کا عالم چشم دل پر چھا گیا

آہ۔ ابتک یاد ہے وہ تیری پیاری انجمن | کس قدر دلچسپ تھی احباب کی بزمِ سخن

وہ رشیدِ خوش بیاں۔ وہ مظہرِ معنی طراز | جنکے اک اک شعر میں سو سو طرح کے سوز و ساز

شوقی و فیاض فاروقی سخن رس نکتہ داں | شاعرِ شیوا بیان و ناثرِ شیریں زباں

بحرِ موّاجِ مضامینِ نوی نازک رقم | حضرتِ ادریس صدیقی کا وہ زورِ قلم

عالمِ اخبار کی وہ معرکہ آرائیاں | اپنے اپنے طرز پر سب کی قلم فرسائیاں

مستِ صہبائے سخن سرشار کی کیفیتیں — اور وہ ایجاد کے اشعار کی کیفیتیں

حضرتِ میکش دکن میں گو وطن سے دور تھے — آتے جاتے رہتے تھے اسمیں نہ کچھ مجبور تھے

عارفِ و نعمت کا وہ حسنِ تخیل دور کا — اور بزرگانہ کرم وہ شوکتِ مغفور کا

وہ حکیم ارشاد احمد عیش و باطن تھانوی — ذوقی و انعام انصاری و محسن تھانوی

عاقلِ خوش فکر و احسانِ سخنور باکمال — طالبِ نغمہ سرا و جوشِ پاکیزہ خیال

الغرض شیرازہ اچھا تھا بکھرنے کے لئے — ہستیاں ہوتی ہیں پیدا جیسے مرنے کے لئے

اب تامل اسمیں ہے یہ واقعی تھا یا نہ تھا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

جیتی جاگتی تصویر

کتنے اصرار سے دی چھپنے کو تصویر اپنی — اور سمجھا کئے رسوائی ہے تشہیر اپنی

یعنی خود محوِ تماشا کا تماشا ہونا — کچھ تعجب سا تھا اُن کے لئے ایسا ہونا

یا یہ کہئے کہ طبیعت میں نمائش ہی نہیں — خواہشِ مدح و تمنائے ستائش ہی نہیں

ایک ہمکیش کی صورت جو نظر آئی ہے — آج ممنونِ نظر چشمِ تماشائی ہے

خوب نقاش مضامیں کا یہ نقشہ دیکھا — بولتی چالتی تصویر کا جلوہ دیکھا

ایسے ہوتے ہیں خوش افکار طبیعت والے — ایسے ہوتے ہیں مزیدار طبیعت والے

کوئی اس پیکرِ تصویر کو مجھ سے پوچھے — اِس خموشی میں بھی تقریر کو مجھ سے پوچھے
بیزبانی میں بھی دعویٰ تھا زباندانی کا — نقشِ تصویر بھی آئینہ تھا حیرانی کا
ہوا صورت سے عیاں ذہن میں تھا جو کچھ — سُننے والوں نے سُنا اُس نے کہا جو کچھ

کیا کہوں عالمِ تصویر کا اندازِ سکوت — صدقے صد شانِ تکلم ترے آوازِ سکوت
ہائے وہ حُسنِ تخیل کا سماں آنکھوں میں — ایک دُنیائے تصور تھی نہاں آنکھوں میں
کیسی کیفیتیں حاصل ہیں فراموشی میں — اِس مرقع سے کوئی پوچھ لے خاموشی میں

شاہدِ شعر کے صورتگر و مانی نادر — حُسن افروزِ عروسانِ معانی نادر
چہرہ پردازِ سخن جلوہ طرازِ اشعار — ناظمِ بے بدل و شاعرِ شیریں گفتار

ہر طرف دھوم ہے تیری سخن آرائی کی
سچ تو یہ ہے کہ یہی شان ہے گویائی کی
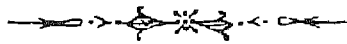
خیر مقدم دوست

ہجر میں جسکے ہوا تھا مرا تن مثل قدید
مدتوں سے تھی مجھے جسکی تمنائے دید

جسکی فرقت میں شب قدر کی کچھ قدر نہ تھی
اور تھا مجھکو محرم کی طرح روز عید

واسطے جسکے دعا مانگتا تھا میں از شد
ہاتھ پھیلا کے بدرگاہِ خداوند رشید

شکر صد شکر ملاقی ہوا وہ آج آکر
جو کہ دل سے تو قریب اور تھا نظروں سے بعید

وحشت غربت سے چلے آئینگے آوارہ مزاج
گردشِ چرخ سے ہو سکتی تھی کس کو امید

دل میں وہ جوش مسرت ہو کہ سبحان اللہ
واہ وا آئے ہیں کیسے مرے ایام سعید

پھر وہی لطفِ ملاقات وہی بزمِ طرب
پھر وہی لطفِ سخن اور وہی گفت و شنید

برزباں اب تو ہے یہ شعر کسی شاعر کا
جو کہ تھا اپنے زمانہ میں یگانہ و وحید

للہ الحمد ہر آنچیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

سیرِ باغ

صبح کا تھا وقت اور سورج ابھی نکلا نہ تھا
ٹھنڈی ٹھنڈی چل رہی تھی باغ میں بادِ صبا

جھومتے تھے اس ادا سے صحنِ گلشن میں درخت
ہو اثر انگڑائیوں میں جیسے خوابِ ناز کا

سبز پوشاکیں پہن رکھی تھیں شاخوں نے تمام
قطرۂ شبنم کے موتی ٹانک رہے تھے جابجا

ہنس بھی پڑتی تھیں جھکتی بھی تھیں شرماتی بھی تھیں
چھیڑتی تھی آ کے کلیوں کو اگر موجِ ہوا

کھل کھلا کر ہنس رہے تھے پھول سارے باغ کے
کر رہی تھی عنبر افشانی شمیمِ جانفزا

عندلیبانِ چمن اس شان سے تھیں نغمہ زن
جیسے گائے کوئی صوفی وجد میں حمدِ خدا

فاختہ بیٹھی ہوئی تھی سرو پر اک ناز سے
قمریاں "حق سرہ" کی دیتی پھرتی تھیں صدا

ننھی ننھی تتلیوں کا چھوٹے پودوں پر ہجوم
وہ لپٹنا پھول سے۔ اڑنا۔ پھر آ کر بیٹھنا

لہلہاتا تھا ہوا سے سبزۂ سرمستِ خواب
جیسے بیٹھی نیند سے ہے یہ ابھی سو کر اٹھا

ناچتا تھا مور اپنی دم پھیلائے بار بار
کر رہے تھے زمزمہ سنجی طیورِ خوشنوا

پردۂ مشرق سے آخر آفتاب آیا نکل
اور شعاعوں سے زمانہ سارا روشن کر دیا

آ چلی گرمی ہوا میں اور تپش بڑھنے لگی
رفتہ رفتہ دھوپ نے نقشہ لیا اپنا جما

اب کمی ہونے لگی دلچسپیِ گلزار میں
اور وقتِ سیر بھی اب ختم بالکل ہو گیا

پہنچا تھوڑی دیر میں خورشید نصف النہار
اور بڑے گھنٹے نے ٹن ٹن سے دئے بارہ بجا

کچھ عجب پژمردگی سی چھا گئی ہر پیڑ پر
پتے مرجھائے ہوئے ہر پھول کملایا ہوا

اب نہ ویسی تازگی تھی اور نہ شادابی کہیں
اتنے ہی عرصہ میں عالم ہو گیا اک دوسرا

اڑ گئے ایک ایک کر کے سارے مرغانِ چمن
باغ کا مالی فقط تنہا وہاں بیٹھا رہا

زندگی باقی ہے تو کل آئیں گے پھر وقتِ صبح
میں بھی ارشد سوچ کر یہ اپنے گھر آیا چلا

تضمین دلنشیں

موسم برسات فصلِ خوشگوار
جھوم کر آئی گھٹا مستانہ وار
ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا یہ سبزہ زار
ہو گیا ہے اب تو دل بے اختیار

ساقیا برخیز و پر کن جام را
خاک بر سر کن غمِ ایام را

میں شرابِ عشق سے مخمور ہوں
بیخودیِ شوق میں مسرور ہوں
محوِ حسنِ جلوۂ مستور ہوں
کشمکش سے زندگی کی دور ہوں

بادہ دردہ چند ازیں بادِ غرور
خاک بر سر نفسِ نا فرجام را

ہونیوالا ہوں میں سوئے جہاں
چاہتا ہوں پھر وہی بیباکیاں
اہلِ ظاہر کہہ رہے ہیں پھبتیاں
ہو کرم کی اک نظر پیرِ مغاں

ساغرِ مے در کفم نہ تا ز سر
برکشم ایں دلقِ ازرق فام را

دیدۂ تر تو نے یہ کیا کر دیا
گرچہ مجھکو خوب رسوا کر دیا
آنسوؤں سے راز افشا کر دیا
خیر پختہ مغز ایسا کر دیا

گرچہ بدنامیست نزدِ عاقلاں
مانمیخواہیم ننگ و نام را

سوزشِ پنہاں کا کیا کیجے بیاں
آہ نہیں سکتی لبوں تک بھی فغاں
کر سکے اظہار کب تابِ زباں
کیا سُنے گا کوئی میری داستاں

دودِ آہِ سینۂ سوزانِ ما
سوخت ایں افسردگانِ خام را

کس لئے ہُوں اسطرح سینہ فگار
کس کو میں دکھلاؤں اپنا حالِ زار
کیوں مرا جاتا رہا صبر و قرار
کون ہے دنیا میں میرا غمگسار

محرمِ رازِ دلِ شیدائے من
کس نمی بینم ز خاص و عام را

میں اگرچہ خانماں برباد ہُوں
دلفگارِ ناوکِ بیداد ہُوں
ہمنوردِ قیس یا فرہاد ہُوں
یہ سہی سب کچھ مگر دلشاد ہُوں

یادِ لاآرامے مرا خاطر خوش است
کز دلم یکبار بُرد آرام را

ہے عیاں گلشن سے شانِ کردگار
بلبلیں بھی نغمہ زن ہیں گو ہزار
تختۂ گُل پر بھی آئی ہے بہار
جھومتے ہیں پیڑ بھی مستانہ وار

ننگرد دیگر بسرو اندر چمن
ہرکہ دید آں سروِ گُل اندام را

چار دن کی کامرانی ہی یہاں
رنج ہے یا شادمانی ہی یہاں

چند روزہ زندگانی ہے یہاں
الغرض جو کچھ ہے فانی ہی یہاں

از سر دنیا گذشتی غم مخور
خوش بخور ہم خوش بدار ایام را

آدمی جس امر کی کوشش کرے
لیکن استقلال اسمیں شرط ہے

اور تکلیفوں سے بے پروا رہے
کامیابی ہے اسی کے واسطے

صبر کن حافظ بسختی روز و شب
عاقبت روزے بیابی کام را

حسنِ فطرت

آئی ہے اب کے برس دھوم سے فصلِ بہار
پیڑ ہر اک بن گیا قامتِ موزونِ یار
سرو پہ ہیں قمریاں اور گلوں پہ ہزار
دیکھ سکے یہ سینری دیکھ کے یہ لالہ زار

سبزہ کا نکھرا ہے رنگ صاف ہی ہر برگ و بار
جھومتے ہیں شاخوں پہ غنچے بھی مستانہ وار
موجِ نسیمِ چمن یا ہے خنک کا سوار
صنعتِ قدرت پہ دل چاہتا ہے ہو نثار

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

خوابِ شیریں

رات ناسازیِ آفاق سے حیراں ہو کر
اپنی برگشتگیِ بخت سے گریاں ہو کر
فرطِ آلامِ زمانہ سے پریشاں ہو کر
سرِ بستر جو گیا یاس سے نالاں ہو کر

اِک اُمنڈ آیا خیالات کا دل پر سیلاب
ہو گیا بحرِ تفکر میں سراپا غرقاب

بختِ واژوں کی شکایت تھی لب پر جاری
مضطرب دیکھ کر اپنی کبھی یوں ناچاری
بر زباں تھی فلکِ سفلہ کی ناہنجاری
کبھی اس شعر کو پڑھتا بصد آہ و زاری

شرحِ ایں آتشِ جانسوز نگفتن تا کے
سوختم سوختم ایں سوز نہفتن تا کے

پھر تعمق کی نظر نے یہ تماشا دیکھا
مختصر قصہ کیے دیتا ہوں کیا کیا دیکھا
الم و درد و غم و رنج بلا کا دیکھا
شیشۂ دل میں بھرا خونِ تمنا دیکھا

کہہ نہیں سکتا کہ کیا ہو گئی حالت میری
اور بھی ہو گئی بے چین طبیعت میری

کام دیتے نہ تھے کچھ وہم و گماں اور قیاس
اور آتے تھے ہزاروں ہی طرح کے وسواس
بڑھتا جاتا تھا ہر اِک لمحہ مرا بیم و ہراس
غالب آ کر ہوا اکبارگی ان سب پہ نعاس

رنج واندوہ والم سب چھڑایا اس نے
بیخودی کا عجب اک جام پلایا اس نے

اب نہ کلفت تھی نہ اُلجھن تھی نہ حیرانی تھی
سعی ناکام کی کاہش نہ پشیمانی تھی

نہ تفکر نہ تردد نہ پریشانی تھی
فقط آسودگیوں کی ہی فراوانی تھی

واہ کیا کہنے ترے اے مرے خواب شیریں
کیوں نہ مخلوق سے تو پائے خطاب شیریں

سب کو ہوتی ہے ترے آنے سے قوت حاصل
جسم کو تیری عنایت سے ہے صحت حاصل

نور آنکھوں کو تو دل کو ہے مسرت حاصل
تازگی روح کو ہے تیری بدولت حاصل

تیری ہی ذات سے حاصل ہے توانائی بھی
فہم بھی عقل بھی ادراک بھی دانائی بھی

کشمکش ہائے جہاں سے نہیں ملتا جو فراغ
دل اُلجھ جاتا ہے ہو جاتا ہے بیکار دماغ

اور بجھتا نظر آتا ہے اُمید دل کا چراغ
اور ہو جاتا ہے گم منزل مقصد کا سُراغ

اس قدر جد و جہد کرکے جو تھک جاتے ہیں
جادۂ سعی سے مجبور بہک جاتے ہیں

زندگی تلخ سی ہو جاتی ہے ناکامی سے
یہ خیالات ستاتے ہیں بڑی سختی سے

جی میں آتا ہے گزر جائیے اپنے جی سے
نیند اسوقت بچاتی ہے تو بے چینی سے

مہربانی سے تری چین سے سو جاتے ہیں
فارغ البال ہر اک فکر سے ہو جاتے ہیں

تأہّل

مرد و عورت سے مرکب نوع ہے انسان کی
جس طرح ہستی میں ہے ترکیب جسم و جان کی

لازم و ملزوم ہیں جیسے کہ نور و آفتاب
یا یہ کہئے بوئے خوش گلشن میں ہے جانِ گلاب

اقتضا فطرت کا ہے دونوں میں شانِ اتحاد
ہے یہی قانون ہستی کی عبارت سے مراد

کہہ رہا ہے تجربہ باہم رہو شیر و شکر
کر دیا ہے مطلع ماضی نے استقبال پر

ارتقا کا مسئلہ بھی ڈالتا ہے روشنی
ہے تمدن کی ترقی کا سبب یہ زندگی

گو فرائض میں نظر آتا ہے چنداں اختلاف
متحد لیکن مقاصد میں ہیں دونوں یہ صاف

جبکہ منشائے "نیچرل لا" کا ہو جذبِ اتصال
پھر تعجب ہے کہ ہو تعمیل وجہ انفعال

ہے بقائے نوع انسانی کا اس پر انحصار
ہے نظامِ عالمِ اسباب کا اس پر مدار

ہاں مگر بے احتیاطی کا نتیجہ ہے خراب
یعنی تکلیفیں بڑھا دیتا ہے "نقصِ انتخاب"

اشتراکِ زندگی میں یہ ضروری ہیں صفات
"ہم خیالی" پہلے۔ اُسکے بعد "حسنِ التفات"

ہو نہیں سکتی کبھی پیدا بہم بیگانگی
سعی کی جائے اگر اس میں قرارِ واقعی

جب طبائع ہونگی یکساں لازمی ہے اتفاق
ورنہ نامانوسیت کا خاصہ ہے افتراق

صحبتِ ناجنس سے سو بار ارشدؔ الحذر
زندگی بھی تلخ اس سے عاقبت بھی پرخطر

با مخالف مشرباں یکجا نشستن خوب نیست
ایں غلط مجموعہ را شیرازہ بستن خوب نیست

تعلیم نسواں اور پردہ

بحث احباب کا سبجکٹ تھا یہ کوشش
متفق اس پہ تھے سب عالم و فاضل ہو جائیں
کام لیں صنعت و حرفت سے نہ بیٹھیں خاموش

جوش تقریر سے جلسہ تھا بڑے زوروں پر
ڈاکٹر ہو کوئی جج ہو کوئی ہو بیرسٹر
کمپنی۔ فکٹری۔ ہر شے کی بنائیں مل کر

دیں زراعت کو تجارت کو ترقی اتنی
چھوڑ دیں مال ولایت سے منگانا تاجر
"میڈاِن انڈیا" سامان ہو اتنا اچھا

روم سے شام سے ایران سے آئیں آرڈر
اپنے ہی ملک کی ہر چیز ہو! بڑھ کر چڑھ کر
جسکی فرمائشیں باہر سے کریں سوداگر

فخر ایجاد کا ہم لوگوں کو بھی حاصل ہو
ہم بھی کچھ کام کریں عقل کے گھوڑے دوڑا کے
ہم بھی محنت سے بنانے لگیں ایسی عمدہ

اہل یورپ ہی میں کچھ ایسے نہیں ہیں جوہر
ہم بھی اڑنے لگیں مرکب میں ہوا کے اوپر
لینڈو۔ بائی سکل۔ ریلوے۔ ویگنٹ موٹر

روشنی بجلی کی اور سلسلۂ ٹیلگراف
سینری یہ جو نظر آتی ہے عالم کی نئی
کی ہے امریکہ نے صنعت میں ترقی اس سے

کر کے قائم انھیں۔ دکھلا دیں ہم اپنا بھی ہنر
ہے یہ تعلیم کا پھیلایا ہوا سب منظر
اختراعوں کے لکھے جاتے ہیں جسکے دفتر

کی اسی علم سے انگلینڈ نے حاصل عظمت | روس پر پائی اسی علم سے جاپان نے ظفر
ماحصل نکلا یہی جبتک کہ نہ ہوگی تعلیم | ہو نہیں سکتی کسی قوم کی حالت بہتر
یہی قوموں کی ترقی کا مدارِ کل ہے | زندگی ابتو ہے بے علم کے خوار و ابتر
ختم ہونے پہ نہ آئی تھیں ابھی اسپیچیں | اور باقی تھا کئی ایک کو دینا لکچر
اتفاقاً کہیں ارشد بھی ادھر آ نکلے | اسی سوسائٹی کے ایک تھے وہ بھی ممبر
چند لوگوں نے کہا آپ بھی تو کچھ کہئے | رائے عالی کا بھی اظہار ہو ہم لوگوں پر
بولے تعلیم کے ہیں ایسے فوائد بیّن | جس سے منکر نہیں ہو سکتا کوئی فردِ بشر
طلبِ علم کا مذہب بھی بڑا حامی ہے | زور دیتے ہیں ہمیشہ سے اسی پر لیڈر
جو کہا جائے بجا۔ جتنا کہا جائے درست | فکر لیکن یہ ہے تحصیل ہو اسکی کیونکر
عورتوں کو تو پڑھانے سے تنفر تم کو | اور خواہش یہ کہ لڑکوں کو پڑھاؤ ازبر
تربیت جب نہ ہو تعلیم کہاں سے ہوگی | پہلے بچوں پہ ہوا کرتا ہے ماؤں کا اثر
جب یہی زیورِ تعلیم سے عاری ہونگی | عقل پر آپ ہی بچوں کی پڑینگے پتھر
جو نہیں جانتا خود۔ کیا وہ کسی کو بتلائے | خود ہی جو گم ہو بنے کیا وہ کسی کا رہبر
اخترِ بخت کا چمکانا اگر ہے منظور | روشنی علم کی پھیلائیے گھر کے اندر
لڑکیوں کو بھی ہے ایسے ہی پڑھانا لازم | جیسے ہر علم ہیں لڑکوں کو پڑھاتے فرفر
ایک صاحب نے کہا پردہ ندارد ہوگا | چار آنکھوں سے وہ پھر دیکھیں گی اندر باہر

ہنسکے ارشد نے جواب انکو دیا اے مشفق
تم نہیں جانتے العلم حجاب الاکبر

سانچی

ریاست بھوپال کے مشرقی گوشے کے ایک پُرفضا مقام کا نام "سانچی" ہے جس کو آثار قدیمہ کی تاریخی اہمیت نے بہت زیادہ مشہور کر دیا ہے۔

کس قدر دلچسپ ہے یہ سبزہ زارِ کوہسار
تازگی بخشِ دل و جاں ہے بہارِ کوہسار

کیا سہانی سبزی ہے کیا سوادِ پُرفضا
کیا مزے کی سیر ہے منظر ہے کتنا خوشنما

دستِ قدرت کی نمایاں ہر طرف گلکاریاں
حسنِ فطرت کی عیاں ہر سمت جلوہ زاریاں

تو ہوا "سانچی" کے جنگل غیرتِ باغِ عدن
دامنِ صحرا میں نظارے کو ہے لطفِ چمن

دلکشی کے اور بھی ساماں مہیا ہیں یہاں
یعنی آثارِ قدیمہ یادگارِ رفتگاں

دستبردِ عہد سے جو ہو گئے بالکل کھنڈر
کچھ برائے نام باقی رہ گئے دیوار و در

آج بھی اُن پر برستا ہے مگر جاہ و جلال
اب بھی ظاہر ہو رہا ہے اگلے لوگوں کا کمال

ان عماراتِ شکستہ میں بہت کچھ ہیں نہاں
بودھ مذہب کی ترقی کے زمانہ کے نشاں

یہ فرازِ کوہ پر گنبد جو قائم ہیں ہنوز
دیکھنے آتے ہیں جنکو دور سے سیاح روز

دو مکاں ہیں چار دیواری کی صورت انکی ہے
بیچ میں ہیں ان کے گنبد جنکو کہتے ہیں ٹھٹے

جو تصاریف زمانہ سے شکستہ حال ہیں
مختلف ہیں۔ انکی نسبت جسقدر اقوال ہیں

لوگ کہتے ہیں، بڑا گنبد عبادتخانہ تھا
اور چھوٹا ایک مقدس شخص کا کاشانہ تھا

بعض کی تحقیق سے ثابت ہوئے یہ مقبرے
اصلیت سچ پوچھئے تو انکی تاریکی میں ہے

چند کتبے بھی ہیں انپر جو پڑھے جاتے نہیں
اگلے لوگوں کے نوشتے فہم میں آتے نہیں

سنتے ہیں پہلے یہاں سنکا نگر آباد تھا
فارغ البالی سے جسمیں ہر بشر دلشاد تھا

اب نشاں تک بھی نہیں باقی کوئی اس شہر کا
کھچ رہا ہے ایک نقشہ انقلاب دھر کا

یونہیں مٹ جائینگے سارے نقش ہستی ایکدن
اور ویراں ہوگی کل دُنیا کی بستی ایکدن

خاک میں ملجائینگی یہ چلتی پھرتی مورتیں
اور فنا ہو جائینگی اچھی بُری کُل صورتیں

پھر نہ پیسے گی کسی کو گردشِ لیل و نہار
رنگ لائیگا نہ پھر کچھ انقلاب روزگار

شکوہ جورِ فلک ہوگا نہ قسمت کا گلہ
ٹوٹ جائے گا یہ گونا گونیوں کا سلسلہ

پھر نہ آئے گی گلستاں میں بہارِ جانفزا
اور نہ ہونگے شاہدانِ گُل کبھی جلوہ نما

یہ نسیم صبح کی ہونگی نہ عنبر بیزیاں
اور نہ مرغانِ خوش الحاں کی ترانہ ریزیاں

پھر نہ ہوگا میکدوں میں بادہ نوشوں کا ہجوم
مدرسوں میں بھی نہ ہوگا درس و تدریسِ علوم

منعقد ہوگی نہ پھر احباب کی بزمِ طرب
قہقہے یاروں کے ہونگے اور نہ کچھ شور و شغب

شعر گو ہونگے نہ اُنکی محفلِ شعر و سخن
کوئی سوسایٹی ہوگی اور نہ کوئی انجمن

پھر کمال اپنا دکھائینگے نہ اربابِ نشاط
سب کے سب معدوم ہو جائینگے اسبابِ نشاط

الغرض مٹ جائیگا ہر چیز کا نام و نشاں
ہر طرف چھا جائیگا اک عالمِ ہو کا سماں

تغزّل

آشفتگی سے درخورِ محفل نہیں رہا
اب میں غزل سرائی کے قابل نہیں رہا

۱

نقشِ تصویر ہوں آئینہ حیراں ہوں میں
یعنی منت کشِ نظارۂ جاناں ہوں میں

سادگی ہائے تمنا کہ بصد ناکامی
محوِ امید کرم ہائے فراواں ہوں میں

لذت افزائے خلش کاوشِ چارہ گر ہے
تم سمجھتے ہو کہ گرویدۂ درماں ہوں میں

سوزِ دل نے ہمہ تن داغ بنا رکھا ہے
بہرِ نظارہ گیاں سروِ چراغاں ہوں میں

اب تمنا نہیں ایذا طلبی کی دل کو
ناوکِ یار کا شرمندۂ احساں ہوں میں

کہہ رہا ہے یہ ترا جلوۂ نظارہ سوز
لاکہ عریاں ہوں مگر پھر تہِ داماں ہوں میں

اپنی ہستی ہی سے پہلے جو مٹا جاتا ہوں
کیا کسی وعدہ فراموش کا پیماں ہوں میں

کبھی جمعیتِ خاطر سے ٹھہرتا نہ ہوا
بزمِ جاناں میں دلِ غیر کا ارماں ہوں میں

مجھ سے پوچھے کوئی انجام فریبِ ہستی
عبرت آموز پئے خویش نگاہاں ہوں میں

ذوقِ امید میں کس لطف سے گزری ہے حیات
نارسائی مقدر کا ثنا خواں ہوں میں

ٹھہری آخر کو عبث کوششِ برقِ خرمن
گلشنِ دہر میں نہ سوختہ ساماں ہوں میں

ناگواری سے تری تلخئ ایامِ حیات ۔۔۔ اپنے آغاز میں واماندۂ پایاں ہوں میں

کثرتِ درد سے دل کیوں نہ بھر آئے میرا ۔۔۔ کوئی پتھر تو نہیں آخرش انساں ہوں میں

ایسے ہر وقت تصور میں ہیں اُنکے گیسو ۔۔۔ اپنی آشفتہ مزاجی سے پریشاں ہوں میں

غلطی سے متحیر کو وہ مجنوں سمجھے ۔۔۔ محض اک صورتِ آرایشِ زنداں ہوں میں

دھوم ہو تابشِ خورشید قیامت کی بہت ۔۔۔ اے خدا کاش وہاں چاکِ گریباں ہوں میں

ہائے ناکامیِ جاوید مری اے ارشد
وقفِ یاس والم و حسرت و حرماں ہوں میں

۲

کر آئے سیر ہم بھی ترے جلوہ گاہ کی ۔۔۔ کشتِ اُمید نذر تھی برقِ نگاہ کی

باتیں وہ کر رہے ہیں محبت کی چاہ کی ۔۔۔ اے جذبِ دل یہی تو ہے تاثیر آہ کی

ہم محوِ ذوقِ دید ہیں ۔ بزمِ خیال میں ۔۔۔ تصویر کھینچ لی ہے تری جلوہ گاہ کی

کچھ انتہا بھی میری سیہ کاریوں کی ہے ۔۔۔ نکلی نہ آرزو کبھی دل سے گناہ کی

چند آرزوئیں مردہ کچھ ارماں مٹے ہوئے ۔۔۔ حالت نہ پوچھیے دلِ حسرت پناہ کی

تیار التفات تو ہو جائیں وہ مگر ۔۔۔ تجویز پہلے سوچ لیں کوئی نباہ کی

ہاتوں میں اُنکے دزدِ حنا گیسوؤں میں خم ۔۔۔ یہ صورتیں ہیں دل کے لئے اشتباہ کی

اللہ اپنی تیرگیِ بخت کیا کہوں ۔۔۔ گرہ ۔۔۔ ظلمات دھوپ ہے مرے روزِ سیاہ کی

ارماں بھرے دلوں کو بھی بے چین کر دیا ۔۔۔ حسرت نصیب کون تھا یہ جس نے آہ کی

نا آشنائے محض ستمگر جفا شعار — اُسکو پڑی ہے کیا مرے حالِ تباہ کی

محشر میں سب ہیں محو تماشائے حسنِ یار — سُنتا نہیں ہے کوئی کسی دادخواہ کی

رندانِ بادہ نوش کو زاہد نہ کہہ برا — دیواریں تجھپہ گر نہ پڑیں خانقاہ کی

تارِ نظر ہیں ڈھونڈھتے ہیں نقش پا دوست — کرنیں زمیں پہ گرتی نہیں مہروماہ کی

سینہ میں ہے مرے نہ خمِ زلفِ یار میں — ملتی خبر نہیں دلِ گم کردہ راہ کی

تم خود ہی کردو میری وفاؤں کا فیصلہ — حاجت بیاں کی ہے نہ ضرورت گواہ کی

کیا میکدے میں شیخ جی تشریف لا گیے ہیں — آواز آرہی ہے یہ کیوں قاہ قاہ کی

ارشدؔ لکھی ہے خاطرِ ذوقیؔ سے یہ غزل — خواہش نہیں ہے بزم میں کچھ واہ واہ کی

۳

کچھ نہ کچھ گوشۂ دل میں مرے پنہاں نکلا — کبھی ناوک کبھی نشتر کبھی پیکاں نکلا

کام تجھسے کبھی اے گردشِ دوراں نکلا؟ — کوئی اُمید برآئی کوئی ارماں نکلا؟

جلوۂ طور کے مشتاق بہت تھے موسیٰ — وہ بھی اندازِ حجابِ رخِ جاناں نکلا

کردیا خوگرِ غم اُسکی جفا کوشی نے — میں نہ خمیازہ کشِ رنجِ فراواں نکلا

دھوم ہنگامۂ محشر کی بہت سنتے تھے — یہ تو اک مجمعِ احبابِ پریشاں نکلا

رہ گئی تھی یہی اک بوند لہو کی باقی — قطرۂ خونِ جگر نازشِ پیکاں نکلا

چارہ سازوں سے نہ آنکھیں ہوئیں نیچی میری — دردِ دل میرا نہ گرویدۂ درماں نکلا

متردد - متفکر - متحیر - ہو کر
کوچۂ یار سے ہر دید کا خواہاں نکلا

ناز تھا ہم کو بہت جس دلِ مستغنی پر
نگہ ناز کا شرمندۂ احساں نکلا

خندۂ گل میں نہاں چاک گریبانی تھی
سببِ عیش ہی اندوہ کا ساماں نکلا

رعب سے حسن کے کچھ کہہ نہیں سکتا کوئی
جلوۂ یار ہی خود اپنا نگہباں نکلا

ہو تو سکتا ہے مگر پھر بھی نہیں ہوتا ہے
نقشِ امید مرا صورتِ امکاں نکلا

نہ دیا چین پراگندگیِ دل نے مجھے
کبھی جمعیتِ خاطر کا نہ ارماں نکلا

ان بتوں میں تو عجب شان نظر آتی ہے
حسنِ مستور چراغِ تہِ داماں نکلا

لاکھ حالِ شبِ غم اُن کو سنایا ارشد
مدعا دل کا نہ لیکن کسی عنواں نکلا

۴

نظارہ سوز کیوں نہ رخِ بے نقاب ہو
کچھ تو نگاہِ شوق کا آخر جواب ہو

میں انتظارِ لطف میں ہوں بیقرار اور
تم محوِ سیرِ منظرِ صد اضطراب ہو

ناکامیِ امید کے قربان جائیے
کیوں وقفِ آرزو دلِ حسرت مآب ہو

شوریدگیِ عشق سے ہنگامہ زار ہے
اب اور کیا خرابِ جہانِ خراب ہو

پایانِ درد و رنج کی مانند اے فلک
خمیازۂ نشاط میں بھی انقلاب ہو

الجھائیں اسکو میری پریشانیاں اگر
زلفِ دراز کو نہ کبھی پیچ و تاب ہو

نظارگی ہے چشمِ تمنا کے گرد و پیش
کیونکر رہینِ منتِ تعبیرِ خواب ہو

ارماں ٹوٹتے دیکھے نہ جائینگے اے خدا
مانوس اختلاط نہ رنگِ شباب ہو

شیرازۂ خیال کا محشر ہے اک ورق
ارشدؔ غضب ہو جمع اگر یہہ کتاب ہو

تضمین جدید

تضمین

درغم ورنج پریشاں نشود
وزالم چاک گریباں نشود
وقتِ مایوسیِ حرماں نشود
شاکیِ گردشِ دوراں نشود

مرد باید کہ ہراساں نشود
مشکلے نیست کہ آساں نشود
درد آں نیست کہ درماں نشود

رباعی

تعلیم ہے عورتوں کا اچھا زیور
ہو جاتی ہے اس سے انکی حالت بہتر
آنکھوں پہ حیا کا پردہ پڑجاتا ہے
مشہور ہے العلم حجاب الاکبر

تمت

بیاضِ ارشد

رشکِ گلزارِ ارم ہی ہے بیاضِ ارشد
قابلِ دید ہے واللہ بیاضِ ارشد
(شفیق دہلوی)

مصنف حسنِ تخیل کے وہ گوہرِ افکار جن کو انکی جدت پسند طبیعت نے سب سے پہلے دامنِ کاغذ پر بکھیرا ہے، اور حضرت قیصر (ایڈیٹر الحجاب) نے اِن کو ایک سلک میں منسلک کر کے دنیائے سخن میں پیش کیا ہے۔ اسکے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ایک سحر طراز شاعر کا ابتدائی کلام کسقدر دلچسپ ہوتا ہے۔ ہر غزل مرصع اور ہر شعر تیر و نشتر ہے۔ ۸؍ قیمت پر مصنف موصوف سے بھوپال کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

حسن تخیل کے ملنے کا پتہ

منیجر انڈین پریس ۔ الہ آباد

Date	No.	Date	No.